جلد ۹۶ — جنوری ۱۹۸۲ء — عدد ۵

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفور

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ہماری نئی مطبوعات

مفکر اسلام سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شہرۂ آفاق تفسیر تفہیم القرآن

کا اسپیشل سیٹ اور ترجمہ قرآن مجید کا تیسرا ایڈیشن شائع ہو چکا ہے

اس کے علاوہ ادارہ ترجمان القرآن کی نئی کتابیں

- ○ مولانا مودودی کے سیاسی افکار — از عبدالکریم عابد
- ○ دولت آصفیہ اور حکومت برطانیہ — از سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ
- ○ سفینۂ نجات — از جلیل احسن ندویؒ
- ○ تحریک اسلامی کے ماخذ — از سید اسعد گیلانی

طبع ہو کر جلد آنے والی ہیں

پہلی بار تفہیم القرآن آفسٹ کاغذ پر شائع کیا جا رہا ہے

خوبصورت لیدر بائنڈنگ اور خوشنما چھپائی۔

اس کے لیے اپنا آرڈر بک کرالیں:

ادارہ ترجمان القرآن ۸-5 ذیلدار پارک اچھرہ لاہور

اعراض ۱۶۶ موتی چند بلڈنگ، انارکلی، لاہور

مکتبہ ترجمان القرآن لاہور — ۴۰- اردو بازار لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست مضامین

عدد ۵	جنوری ۱۹۸۲ء مطابق ربیع الاول ۱۴۰۲ھ	جلد ۹۶

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

فون نمبر ——— ۴۱۰۳۱۶

چندہ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ -/۳ روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اشارات

یہ مہینہ! — جانتے ہو یہ کونسا مہینہ ہے؟

یہ وہ مہینہ ہے جس میں دُنیا کا وہ سب سے بڑا انسان پیدا ہوا جس نے تاریخ کے دھارے کا رُخ موڑ دیا۔ آج دُنیا کا کوئی معاشرہ اور کوئی فرد ایسا نہیں جس تک اُس عظیم ہستی کے پیغام اور نمونۂ عمل کی کوئی نہ کوئی کرن نہ پہنچی ہو، بعض تک بلا واسطہ، بعض تک کئی واسطوں سے ہو کر — بعض تک شعور کے راستے، اور بعض تک غیر شعوری طریق سے۔

یہ ہستی تھی رسولِ برحق اور معلّمِ انسانیت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی!

اِس موقع پر جلسوں کا ہونا، جلوس نکلنا، اخبارات و رسائل کے خاص نمبروں کی اشاعت، ریڈیو ٹیلیوژن سے خاص قسم کی نشریات، یہ سب کچھ اپنی جگہ، مگر بڑا سوال یہ ہے کہ اس ماہ مبارک اور یومِ میلاد کی آمد کا ہمارے ذہن و کردار پر کیا اثر پڑنا چاہیے۔

پہلی چیز تو اس دعوتِ توحید کا دلوں میں اُبھرنا ہے جسے حضورؐ لے کے آئے تھے۔ ربیع الاوّل کی آمد پر پیدا ہونے والے جذبات کے تحت ہم کو ہر قسم کے شرک کی آلائش سے اپنے آپ کو پاک کرنے کا عزم کر لینا چاہیے۔

دوسری چیز یہ شعور ہے کہ محبتِ رسولؐ کے معنی میں اوّل نمبر پر اطاعتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم داخل ہے۔ لٰہذا سچے محبانِ رسولؐ کو عزم کر لینا چاہیے کہ وہ نمونۂ رسالت کے مطابق دینی مقاصد کے لیے سرگرمِ عمل ہوں گے اور سنّت کا تمام مخالفانہ حملوں سے تحفّظ کریں گے۔

تیسری چیز یہ کہ حضورؐ خیر البشر صلی اللہ علیہ وسلم سے جس کو بھی سچا رشتۂ وفا جوڑے رکھنا ہو وہ یہ فیصلہ کرے کہ وہ دانستہ کبھی حرام کمائی حاصل نہیں کرے گا اور حرام راستوں میں خرچ نہیں کرے گا۔ حضورؐ

کے آدمیوں کا ایک اصول رزقِ حلال کی پابندی کرنا ہے۔ صرف اس ایک پابندی سے بے شمار جرائم اور مظالم کا سلسلہ رُک جاتا ہے۔ حرام روزی کے ساتھ نہ ہی خدا پرستی پروان چڑھتی ہے، نہ محبتِ رسالت، نہ عبادات قبول ہوتی ہیں اور نہ معاملات درست!

چوتھی اہم چیز یہ ہے کہ ولادتِ رسولؐ کی خوشی منانے والے اپنے دل و نظر کو موجودہ حیا سوز ماحول سے پاک رکھنے کی انتہائی کوشش کریں۔ ساتھ ساتھ دل و نظر کی پاکیزگی کے لیے ماحول کو ساز گار بنانے کی مساعی جاری رکھیں۔

پانچویں چیز یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہر مخلص اُمتی کو ظلم کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے، خواہ وہ ظلم زبان سے ہو یا ہاتھ سے یا مال سے یا دماغ سے۔

چھٹی چیز یہ ہے کہ ہر مسلمان رسولِ خدا کا سپاہی بن کر اُٹھے اور اس نظامِ حیات اور تہذیب کا علم بلند کرے، جس کے لیے حضورؐ نے مشقتیں اُٹھائیں اور آپؐ کے ساتھ آپ کے صحابہؓ نے قربانیاں دیں۔ اس نظامِ حیات سے ٹکرانے والے ہر نظریے اور ہر تحریک کی عقلی اور سماجی اور سیاسی طور پر مزاحمت کرنی چاہیے۔

ماہ ربیع الاوّل اور میلادالنبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہوگا اصل استقبال!

بدرجۂ تنزل میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر ربیع الاوّل کی سعادتوں سے بہرہ مند ہو کر کوئی شخص اتنا ہی فیصلہ کر لے کہ اب وہ نماز پابندی سے پڑھے گا، کوئی گوالا یہی عہد باندھ لے کہ وہ اپنے پیغمبرؐ کی محبت کے زیر اثر اب دودھ میں پانی نہیں ملائے گا، ایک کلرک یا کانسٹیبل درود شریف پڑھتے ہوئے اس عزم پر جم جائے کہ اب وہ رشوت نہیں لے گا۔ ایک واعظ یہ پیمان استوار کرے کہ نبی اکرمؐ کی شفاعت کے حصول کے جذبے کے تحت آئندہ کبھی تفرقہ بازی نہیں کرے گا اور بے سند قصے کہانیاں بیان نہیں کرے گا۔ ایک گاڑی بان یہ من سمجھوتہ کرے کہ وہ ٹریفک کے قواعد کو توڑ کر دوسروں کے لیے وجۂ آزار نہیں بنے گا، یا ایک خاتون اس بات کا تہیہ کرے کہ وہ پردہ کی حدود کی پابندی کرتے ہوئے اپنی زینتوں کو چھپائے گی، مردوں سے خلا ملا نہیں رکھے گی اور اپنے بچوں کی تربیت اور اپنے رشتوں کی درستی اور گھر کے ماحول کی اصلاح کو

اوّلین ذمہ داری سمجھے گی تو کہیے کہ ایسے لوگوں نے ربیع الاوّل میں بہنے والے برکتوں کے دریا سے جام و سبو بھر لیے۔ اس سے بھی نیچے اتر کر اگر کوئی فرد یہی تہیہ کر لے کہ وہ آج سے راستوں میں گندگی نہیں پھیلائے گا۔ یا وہ کوئی گالی زبان پر نہ لائے گا۔ یا کسی کی کوئی چیز اجازت کے بغیر استعمال نہیں کرے گا تو یہ بھی خیر و برکت کی باتیں ہیں۔ میری نگاہ میں تو اتنی سی تبدیلی بھی انقلابِ احوال کی طرف ایک قدم ہوگی کہ پیروانِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ طے کر لیں کہ وہ میلاد کے جلوسوں میں اسلامی شریعت و اخلاق کے خلاف کوئی حرکت نہیں کریں گے۔ خصوصاً کعبہ یا روضۂ نبوی کے ماڈل بنا بنا کر وہ معاملہ نہیں کریں گے جو مشرک قومیں تماثیل سے کرتی ہیں۔

مطلب یہ نہیں کہ ان میں کوئی ایک بات اختیار کر لینے سے پوری دینداری ہو گئی یا منشائے صاحبِ نبوت پورا ہو گیا، بلکہ نیکی کی اس بڑی دنیا کی طرف ایک دروازہ کھل گیا جسے ہم اسلام کہتے ہیں۔

لیکن اگر حضورؐ کے ماہِ ولادت یا یومِ ولادت کے آنے سے اور اس کی خوشیاں منانے سے نہ معاشرے میں کوئی اجتماعی تبدیلی آئے، نہ فرد کے خیالات و اعمال میں کوئی تغیر ہو تو پھر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ہم لوگوں کی اصل دلچسپی کھیل تماشوں، انبوہ، شور و غوغا اور جھنڈیوں، محرابوں سے ہے۔ بس اگر کھیل تماشوں اور انبوہ و غوغا میں مذہبی تقدس کا رنگ شامل ہو جائے تو ہمارے ذوق کی زیادہ سے زیادہ تسکین ہو سکتی ہے۔ لیکن ہمارا ذوق خواہ کچھ بھی ہو، خدا کا دین بہرحال کھیل تماشوں سے ہمارا دل بہلانے نہیں آیا ہے۔ نہ حضورؐ کی بعثت کی غایت اس سے پوری ہوتی ہے کہ سال میں ایک بار خوب تقریریں، نعتیں، قوالیاں اور درود و سلام ہو جائیں اور جلسے جلوس کی بہار آ جائے۔ اور امت پھر انہی کمائیوں، عادتوں اور مشغلوں میں مست ہو جائے، جنہوں نے ایک عرصے سے اس کے گرد گھیرا ڈال رکھا ہے۔

دوستو! کبھی ربیع الاوّل کے آنے پر ربیع الاوّل کا اصل پیغام سنو! ربیع الاوّل میں ولادت پانے والی نور افروز شخصیت کے مقصد پر غور کرو: وہ مقدس شخصیت جس دین کو دے گئی تھی اس کے تقاضوں پر توجہ دو۔

صرف یہی راستہ ہے بہتر زندگی کا، اور صرف یہی راستہ ہے آخرت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت سے بہرہ مند ہونے کا!

حضورؐ اکرم کا معجزۂ کردار

جناب سید اسعد گیلانی صاحب

حضورؐ اکرم نے دعوتِ اسلامی کا آغاز ایک فرد فی قوم کے تناسب سے کیا۔ پوری قوم ایک طرف تھی اور حضورؐ اکرم پوری قوم کے مقابل دوسری طرف تھے۔ جو دعوت آپ نے پیش کرنی شروع کی وہ پوری قوم کے سارے ڈھانچے کو ادھیڑ کر اسے از سرِ نو استوار کرنے والی تھی۔ اور یہ بات قریش تک حضورؐ کے پیش کردہ صرف ایک کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے چند الفاظ سے ہی سمجھ گئے تھے۔ اس دعوت کے ذریعے پورے معاشرے کی قدریں بدلی جا رہی تھیں۔ خیر و شر کے پیمانے منقلب ہو رہے تھے۔ معیاراتِ قیادت و رہنمائی تبدیل ہو رہے تھے۔ نفع و نقصان کی میزان بدل رہی تھی۔ دعوتِ اسلامی کا مسئلہ صرف چند مذہبی تصورات میں تھوڑی سی تبدیلی لانے کا ہی معاملہ نہیں تھا بلکہ یہ تو ہر پہلو ہر جہت اور کلی تبدیلی تھی جس کے آنے کے بعد ہر چیز بدل جانے والی تھی۔ چمگادڑوں سے کہیے کہ وہ طلوعِ سحر کو ٹھنڈے پیٹوں ہنسی خوشی برداشت کر لیں تو یہ ایک ناقابل قبول مطالبہ ہے۔ چنانچہ عین توقع کے مطابق اسلام کی دعوتِ عام کے ساتھ ہی مخالفتِ عام بھی شروع ہو گئی اور پھر تو بے پناہ مخالفت ہوئی۔ حضورؐ اکرم نے خود فرمایا کہ کسی نبی کو ان مشکلات سے سابقہ پیش نہیں آیا جن مشکلات سے مجھے سابقہ پیش آیا ہے۔

اس کلی انقلابی دعوت کو نظامِ باطل کے چوکیدار برداشت نہ کر سکتے تھے۔ وہ لوگ جو سیاسی اور معاشرتی مفادات کے محافظ تھے۔ ان کے لئے اس دعوت کو ہضم کرنا سخت مشکل تھا۔ اس دعوت کو برداشت کرنے کے معنی اپنی سابقہ حاصل کردہ سیادتوں، قیادتوں اور محفوظ مفادات سے دستبرداری اور محرومی تھی۔ چنانچہ دعوت کے سامنے آتے ہی وہ بھوکے بھیڑیوں کی طرح حضورؐ اور آپؐ کے ساتھیوں پر پل پڑے ایسی شدید مخالفانہ یلغار اور اتنی کثیر طاقتور مخالفت کے مقابلے میں ایک فرد فی قوم کے تناسب سے آغاز کر کے

ایک انقلابی دعوت کو آگے بڑھانا کوئی آسان کھیل نہ تھا۔ یہ آنکھوں دیکھتے اپنی موت سے کھیلنے والی بات تھی لیکن اس کے باوجود اتنی بڑی مخالفت اور عداوت کے مقابلے کے لئے حضورؐ اکرم کے پاس ایسے انقلاب انگیز ہتھیار تھے جن کا مخالفین کے پاس کوئی توڑ نہ تھا۔ ان میں سب سے پہلا مؤثر اور کارگر ہتھیار حضورؐ اکرم کا اپنا کردار تھا۔ جو آپ نے قریش کے درمیان چالیس سالہ زندگی میں ان کے سامنے رکھا تھا۔

ایک شخص جس کی شرافت کی شہرت دور دور تک تھی۔ جس کی حیا کنواری لڑکیوں کی طرح کسی غیر محرم کی طرف بے جا نظر اٹھانے کی بھی روادار نہ تھی۔ جس کی دیانت و امانت کا یہ حال تھا کہ دشمن بھی آپ کے پاس امانتیں رکھواتے تھے۔ اس دیانت و امانت کا سکہ اتنا رواں تھا کہ جب اپنی قوم کے ظلم و ستم سے تنگ آکر حضورؐ اکرم نے ہجرت کی تو اس وقت بھی اسی ظالم قوم کی امانتیں حضورؐ اکرم کے پاس اتنی جمع تھیں کہ آپ کو حضرت علیؓ کی ڈیوٹی لگانی پڑی کہ وہ اس ظالم قوم کی سب امانتیں واپس کر کے مدینہ تشریف لائیں۔ ان حالات میں بھی حضورؐ کے انصاف پر سب اعتماد کرتے تھے۔ مخالفین اپنے مقدمات و تنازعات کے فیصلوں کے لئے حضورؐ کے پاس آتے تھے۔ حضورؐ کی طرف سے بے سہارا، بیواؤں کے وظیفے مقرر تھے اور آپ یتیموں کی سرپرستی فرماتے تھے۔ آپ مظلوموں کی حمایت کا اہتمام کرتے تھے اور رشتہ داروں اور عزیزوں سے صلہ رحمی سے پیش آتے تھے۔ کسی نے کبھی کوئی نازیبا بات آپ کی پوری مدتِ عمر میں آپ کی زبان سے نہ سنی تھی اور کوئی اس بات کا گواہ نہ تھا کہ حضورؐ نے کبھی کسی سے جھگڑا کیا ہو کسی کو گالی دی ہو۔ کسی سے کبھی کوئی زیادتی کی ہو۔ کسی سے وعدہ خلافی کی ہو اور کسی سے بدمعاملگی کی ہو۔

آپ کے کردار کا خود اللہ تعالیٰ محافظ و نگران تھا۔ بچپن میں جب آپ بکریاں چراتے تھے اور آپ کا بیشتر وقت شہر سے باہر دشت و صحرا اور پہاڑوں میں گذرتا تھا۔ اس وقت آپ کو اللہ تعالیٰ کی ذات اور اس کی کائنات پر غور و فکر کرنے اور فطرت کی گود میں رہ کر اس کا قریبی احساس کرنے کے مواقع میسر تھے۔ ان حالات میں بھی جب آپ لڑکے تھے اور لڑکوں میں کھیل تماشے کا شوق عمر کا عمومی تقاضا ہوتا ہے۔ آپ کبھی کسی کھیل تماشے میں دلچسپی نہیں لیتے تھے۔ آپ کے ساتھی چرواہے اکثر شہر میں ایسی تقاریب میں شرکت کے مواقع ڈھونڈتے رہتے تھے۔ جہاں راگ رنگ ہو لیکن آپ ایسی باتوں سے ہمیشہ بے نیاز رہتے تھے۔ ایک بار اپنے ایک ساتھی چرواہے کے اصرار پر آپ نے شہر میں کسی شادی پر گانے بجانے کی مجلس میں شرکت کا ارادہ کر لیا۔ گرمی کا موسم تھا اور جب آپ شہر میں پہنچے تو ابھی مجلس منعقد ہونے میں بہت دیر تھی۔ آپ تقریب گاہ کے باہر سامنے ہی انتظار کرنے کے لئے بیٹھ گئے اور پھر آپؐ پر غنودگی طاری ہو گئی۔ جب بیدار ہوئے تو مجلس منعقد ہو کر برخواست ہو چکی تھی۔ بس اس واقعہ کے بعد آپ نے ابھی

کسی مجلس میں شرکت کا کبھی ارادہ نہیں کیا۔

تعمیر کعبہ میں شہر کے سارے ہی نوجوان حصہ لے رہے تھے اور حضورؐ بھی پتھر اٹھا اٹھا کر لا رہے تھے۔ حضورؐ کے چچا عباس بن عبدالمطلب نے کہا کہ "بھتیجے تم خراش سے بچنے کے لئے تہمد اتار کر کندھے پہ رکھ لو۔" اور جب آپؐ نے اس سے پہلو تہی کی تو انہوں نے از راہ ہمدردی اور بزرگی خود ہی آپؐ کا تہمد اتار کر آپؐ کے کندھے پہ رکھ دیا لیکن حضورؐ فرطِ حیا سے تھرا کر نیم بے ہوشی کی حالت میں زمین پر گر پڑے۔ آپؐ نے اس پر اتنی شدید ندامت محسوس کی کہ پھر اس کا کبھی تصور تک نہ کیا۔

جوانی کا دور انسان کے لئے بڑا رنگین دور ہوتا ہے۔ عمر کے اس حصے میں ہر شے حسین و دلفریب دکھائی دیتی ہے۔ جوانی کو دیوانی تو کہا ہی جاتا ہے لیکن حضورؐ اکرم کو قدرت نے ایسی صالح اور سعید فطرت سے نوازا تھا کہ جذبات کا بے قابو ہونا تو درکنار کبھی خیال کا دامن بھی آلودگیوں سے نہ چھوا تھا۔[۱] مکہ کے اس رنگین اور آزاد ماحول میں جہاں قدم قدم پر ہوس کیاں جال پھیلائے ہوئے تھیں اور نفس کے لئے تمام رغبتیں اور مرغوبات موجود تھیں۔ جہاں سفلی جذبات کی تکمیل و تسکین کے لئے طرح طرح کی آسانیاں معاشرے کے رسم و رواج میں ہی موجود تھیں وہاں حضورؐ نے جوانی کا زمانہ اس قدر پاکیزگی اور شرافت و احتیاط کے ساتھ گزارا کہ پاکیزگی کا زیادہ سے زیادہ تصور بھی اس معصوم و پاکیزہ جوانی کے مقابلے میں فروتر ہی دکھائی دیتا ہے۔ پھولوں کی پتیاں بہت صاف و شفاف ہیں۔ قوس و قزح نہایت معصوم ہے۔ چاندنی بہت اجلی اور بے داغ ہے۔ مگر حضورؐ کی جوانی ان سب سے زیادہ معصوم، پاکیزہ اور عفیف تھی۔ جہاں حسن بے نقاب کو کھلے بندوں متاع ایمان پر ڈاکے ڈالنے کی اجازت ہو وہاں عشق کی کشاکش سے بچ نکلا بہت بڑی سعادت اور حفاظتِ خداوندی ہے۔ جہاں گلی گلی شراب خانے اور گھر گھر جام و مینا کی گردش ہو، جہاں قدم قدم پہ مئے شبینہ کے جام لنڈھائے جاتے ہوں اور ساقی گری کی لاج رکھنے کے لئے ایمان و اخلاق کو بے آبرو کیا جاتا ہو۔ وہاں ایک سعید فطرت انسان کا اس کے ایک قطرے سے بھی اپنے آپ کو پاک رکھنا فرشتوں کی سی صفت ہے۔ جہاں جنگ کھیل ہو اور انسانی خون بہانا ایک تماشا ہو وہاں انسانیت کے احترام کا علمبردار ایک ایسا انسان بھی موجود ہو جس کے دامن پر خونِ ناحق کی ایک چھینٹ بھی نہ پڑی ہو۔ جہاں بتوں کے سامنے سجدہ ریزیاں ہوں،

۱؎ محبوب خدا۔ چودھری فضل حق

غیر اللہ کے سامنے نذر و نیاز ہوں ، زمانہ حج میں برہنہ طوافِ کعبہ شعائر مذہب میں شامل ہو وہاں ابراہیمی فطرت کا ایک انسان پاکیزگی ،عفت نگاہی اور توحید پرستی کی تصویر بنا ہوا موجود ہو۔جہاں قدم قدم پر قمار خانے ، بدکاری کے اڈے ، داستان گوئی کے چوپال ، لہو ولعب کی مجالس ، گانے بجانے کی محفلیں ، حسین وگداز جسموں کی تھرتھراہٹیں اور بانکپنیں نوجوانوں کا راستہ دیکھتی ہوں وہاں ایک پاکیزہ فطرت ہاشمی نوجوان تزکیہ وطہارتِ نفس کی تصویر بنا ہوا پایا جاتا ہو اور اس کے دامن پہ ان خرافات کا سایہ بھی نہ پڑتا ہو تو اسے معجزۂ کردار نہ کہا جائے تو پھر کس لفظ سے تعبیر کیا جائے گا اور یہ کردار اگر انسانوں کے دلوں کو، جو دل نیکی اور پاکیزگی سے متاثر ہوتے اور طہارتِ نفس اور شرافت سے مرعوب ہوتے ہیں انہیں مرعوب کر کے اپنا گرویدہ بنالے تو یہ عین انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ ان سب کے درمیان یہی نوجوان تھا جس نے ہر خوبی کو اپنے کردار میں سمیٹ لیا تھا اور جو ہر بدی سے دامن کش تھا جو لوگوں کی آنکھ کا تارا اور ان کے دلوں کا محترم ومکرم مہمان تھا۔

یہی سبب ہے کہ خدیجۃؓ الکبریٰ نے جو مکہ کی امیر وکبیر بیوہ تھیں جب اس نوجوان کو اپنے کاروبار میں آزمایا اور کھرا پایا تو اسے اپنی طرف سے خود نکاح کا پیغام بھیجا۔ بلکہ بلا کر خود بالمشافہ بھی آپؐ سے بات پختہ کی۔ اس موقعہ پر انہوں نے حضورؐ اکرم کے اخلاق کے بارے میں اپنے ذاتی تجربے کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

میں نے آپؐ کی صداقت اور اچھے اخلاق کی وجہ سے آپؐ کو پسند کیا ہے ۔ اس لئے کہ میں آپؐ کی صداقت اور کردار سے متاثر ہو گئی ہوں[۱]

چنانچہ شادی پر خطبۂ نکاح پڑھتے ہوئے حضرت ابوطالب نے جو بچپن سے حضورؐ کے سرپرست چچا تھے آپؐ کے کردار کے بارے میں یہی گواہی دی۔ حمد وثنا کے بعد انہوں نے فرمایا۔

یہ میرے بھائی کا لڑکا محمدؐ بن عبداللہ ہے۔ یہ ایک ایسا نوجوان ہے کہ قریش کے کسی شخص سے اس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔ مگر یہ اس سے بڑھا رہے گا۔ ہاں البتہ مال اس کے پاس کم ہے لیکن مال تو ڈھلتی پھرتی چھاؤں ہے اور ایک بدل جانے والی چیز ہے۔ محمدؐ وہ شخص ہے کہ جس کی میرے ساتھ محبت ویگانگت کو تم لوگ اچھی طرح جانتے ہو۔ اس کا مستقبل خدا کی قسم عظیم الشان

---

[۱] ۔ ابن اسحاق

اور جلیل القدر ہے۔

اس خطبے کا جواب دیتے ہوئے ورقہ بن نوفل جو حضرت خدیجہؓ کے چچا زاد بھائی اور ایک مشہور و معروف عالم و فاضل آدمی تھے۔ انہوں نے کہا۔

حمد و ثنا خدا کے لئے ہے۔ بلاشبہ آپ لوگ تمام خصائل کے اہل ہیں۔ کوئی طاقت آپ کے فضل و شرف کو رد نہیں کر سکتی۔ اور بے شک ہم نے نہایت رغبت کے ساتھ آپ کے ساتھ شامل ہونا پسند کیا ہے۔ پس اے قریش گواہ رہو کہ میں خدیجہؓ بنت خویلد کو محمدؐ بن عبداللہ کی زوجیت میں دیتا ہوں۔

شادی کے بعد آپؐ کاروبار میں پہلے سے بھی زیادہ انہماک سے مصروف ہو گئے۔ ان کے ایک کاروباری ساتھی قیس بن سائب نے آپؐ کے بارے میں کہا۔

کاروبار میں میں نے محمدؐ سے بہتر ساتھی کوئی نہیں پایا۔ اگر ہم ان کا سامان لے کر جاتے تو واپسی پر وہ ہمارا استقبال کر کے صرف ہماری خیر و عافیت پوچھتے اور پھر چلے جاتے اور بعد میں حساب دینے پر قطعی تکرار اور حجت نہ کرتے۔ حالانکہ دوسرے لوگ سب سے پہلی بات صرف اپنے مال کی کیفیت کے متعلق ہی پوچھتے تھے۔ اس کے برخلاف اگر خود وہ ہمارا سامان لے کر جاتے تو واپسی پر جب تک پائی پائی بے باق نہ کر لیتے گھر تک بھی نہ جاتے تھے۔ اس لئے وہ ہمارے درمیان "الامین" کے لقب سے معروف تھے۔

کاروبار کے سلسلے میں ہی ایک شخص عبداللہ بن الحمسا نے آپؐ سے کہا کہ ذرا ٹھہریئے میں ابھی آتا ہوں لیکن وہ جا کر بھول گیا۔ پھر تین دن کے بعد اچانک اتفاق سے وہ ادھر سے گزرا تو حضورؐ وہاں وعدے کے مطابق راستے میں ہی اس کے منتظر تھے۔ وہ آپؐ کو دیکھ کر سخت پریشان ہوا۔ تو آپؐ نے اسے صرف اتنا کہا کہ عبداللہ تم نے ہمیں سخت تکلیف دی۔ ظاہر ہے کہ یہ اخلاق کسی کو گرویدہ بنائے بغیر کیسے چھوڑ سکتا ہے۔

جاہلیت میں قبائل عرب میں لڑائیاں چھڑتیں تھیں تو برسوں چلتی رہتی تھیں۔ ایک بار حرب فجار کے نام سے لڑائی چھڑی تو برسوں تک وقفہ وقفہ سے چلتی رہی یہاں تک کہ اس خونریزی سے قریش تنگ آ گئے اور ان میں پریشانی اور پشیمانی کے زبردست جذبات پیدا ہوئے۔ چنانچہ قریش میں بنو ہاشم کے سردار زبیر بن عبدالمطلب کی تجویز پر ایک انجمن قیام امن و نگرانی "حقوق" قائم کی گئی۔ اس انجمن میں قریش کے قبائل نے مندرجہ ذیل حلف لیا۔

ہم عہد کرتے ہیں کہ

ہم ملک سے بدامنی دور کریں گے، مسافروں کی حفاظت کریں گے۔ غریبوں کی امداد کریں گے۔ اور زیر دستوں کو ظلم سے بچائیں گے اور ظالم کا ہاتھ پکڑیں گے۔

اس انجمن کے اجلاس میں حضورؐ بھی اپنی نوجوانی کے دور میں شامل ہوتے تھے۔ آپ اس کے بعد اپنے دور نبوت میں بھی فرمایا کرتے تھے کہ اگر آج بھی اس انجمن کے اغراض و مقاصد کو پورا کرنے کے لئے لوگ کام کریں تو میں ان کا ساتھ دوں گا۔ حضورؐ ہمیشہ خدمت خلق کے لئے تیار رہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ خلق خدا کی خدمت کے لئے حضورؐ نے محنت اور ایثار و قربانی سے کام لیا ہوگا۔ اس خدمت کے نتیجے میں حضورؐ اپنی قوم کے اندر بے حد مقبول امین و صادق اور خادم خلق مشہور تھے۔

ایک بار جب سیلاب اور بارش کی شدت سے کعبہ کی عمارت کو نقصان پہنچا تو اہل مکہ نے اس کی نئی تعمیر کا فیصلہ کر لیا۔ ہر شخص اور قبیلہ نے اس سعادت میں حصہ لینے کے لئے پوری یکسوئی سے تعمیر کعبہ میں شرکت کی۔ یہاں تک کہ حجرِ اسود رکھنے کا وقت آگیا۔ اس وقت ہر قبیلے کی خواہش تھی کہ یہ اعزاز اسے حاصل ہو۔ اس مسابقت میں بات تو تو میں میں سے بڑھ کر تلوار کے دستے تک جا پہنچی۔ بعض قبائل نے تو خون کا پیالہ سامنے رکھ کر اس پر حلف لے لیا کہ وہ اس اعزاز سے کبھی دست بردار نہ ہوں گے۔ بالآخر ایک معمر بزرگ امیہ بن مغیرہ نے رائے دی کہ کسی کو ثالث بنا کر فیصلہ کر لیا جائے۔ چنانچہ یہی طے پایا کہ جو شخص سب سے پہلے حرم میں آئے اسی کو ثالث بنا لیا جائے۔ اس فیصلے کے بعد اچانک حضورؐ اکرم ہی تشریف لے آئے۔ آپ کو دیکھ کر لوگ دور سے ہی چلانے لگے۔

یہ تو امین آرہا ہے، ہم اس پر راضی ہیں۔ یہ تو محمدؐ ہے۔ ہم اس کے فیصلے پر رضامند ہیں۔

حضورؐ نے حضرت خدیجۃؓ الکبریٰ کے ساتھ پندرہ سال گزارے تھے جب پہلی وحی کے نزول کا واقعہ پیش آیا۔ تو آپؐ اس واقعہ سے بے حد پریشان ہوئے۔ یہ ایک نہایت درجہ غیر متوقع انوکھا اور حیران کن تجربہ تھا جس سے حضورؐ کو اچانک واسطہ پڑا۔ آپؐ کانپتے لرزتے گھر واپس آئے۔ آتے ہی اپنی اہلیہ سے فرمایا کہ مجھے اڑھا دو، مجھے اڑھا دو۔ چنانچہ آپؐ کو کمبل اڑھا دیا گیا۔ جب کچھ سکون ہوا اور آپؐ کی خوفزدگی کچھ دور ہوئی تو آپؐ نے سارا واقعہ سنایا اور سخت پریشانی سے حضرت خدیجہؓ سے کہا۔

اے خدیجہؓ مجھے کیا ہو گیا ہے۔ مجھے تو اپنی جان کا ڈر ہے۔

حضرت خدیجہؓ حضورؐ کی بیوی تھیں۔ بیوی سے زیادہ شوہر کی خوبیوں اور کمزوریوں سے کون آگاہ ہوتا ہے۔ انہوں نے حضورؐ کے بارے میں اس وقت جو گواہی دی وہ یہ تھی۔ انہوں نے کہا،

ہرگز نہیں آپؐ خوش ہو جائیے اے محمدؐ۔ خدا کی قسم، خدا آپؐ کو کبھی رسوا نہ کرے گا، آپؐ رشتہ داروں سے نیک سلوک کرتے ہیں، سچ بولتے ہیں، امانتیں ادا کرتے ہیں، بے سہارا لوگوں کا بار برداشت کرتے ہیں۔ نادار لوگوں کو کما کر دیتے ہیں، مہمان نوازی کرتے ہیں، اور نیک کاموں میں مدد کرتے ہیں اور لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آتے ہیں، آپؐ تو اللہ کے نبی ہیں[1]

اور پھر جب حضرت خدیجہؓ آپؐ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو عالم و فاضل آدمی تھے مطالعہ کر کے عیسائی ہو گئے تھے اور خود انجیل لکھتے تھے۔ بہت بوڑھے اور ضعیف تھے تو انہوں نے حضورؐ کا سارا واقعہ سن کر کہا،

یہ تو وہی ناموس الٰہی ہے (وحی لانے والا فرشتہ) ہے جو اللہ نے موسیٰؑ پر نازل کیا تھا، کاش میں آپؐ کے زمانۂ نبوت میں قوی اور جوان ہوتا۔ کاش میں اس وقت تک زندہ رہتا جب آپؐ کی قوم آپؐ کو نکال دے گی۔

حضورؐ نے حیران ہو کر پوچھا، "کیا یہ لوگ مجھے نکال دیں گے"؟

ورقہ نے کہا " ہاں یہ کبھی نہیں ہوا کہ کوئی شخص وہ چیز لے کر آیا ہو جو آپؐ لائے ہیں اور اس سے دشمنی نہ کی گئی ہو۔ اگر میں نے آپؐ کا زمانہ پایا تو میں آپؐ کی پرزور مدد کروں گا۔[2]

حضورؐ کا پاکیزہ اور بے مثال کردار کھلی کتاب کی طرح پورے چالیس سال سے قوم کے سامنے موجود تھا، اس لئے جب پہلی دفعہ حضورؐ نے لوگوں کو جمع کر کے دعوت اسلامی پیش کرنے کا فیصلہ کیا اور لوگوں کو جمع کیا تو سب سے پہلے اپنے کردار پر ہی ان سے گواہی طلب کی۔

حضورؐ نے کوہ صفا پر کھڑے ہو کر لوگوں کو پکارا، جب سب لوگ جمع ہو گئے تو حضورؐ نے فرمایا تم مجھے

---

[1] ۔ ابن سعد ص ۱۹۰۔

[2] ۔ تفہیم القرآن جلد ششم ۔صفحہ ۳۹۲

بتاؤ کہ تم مجھے سچا سمجھتے ہو یا جھوٹا جانتے ہو۔"

سب نے بیک آواز کہا۔ "ہم نے کبھی کوئی بات غلط یا بیہودہ آپ کی زبان سے نہیں سنی۔ ہم یقین رکھتے ہیں کہ آپ صادق اور امین ہیں۔"

گویا صادق اور امین کے القاب سے جو پوری قوم نے آپ کو اعلانِ دعوتِ اسلام سے پہلے ہی دے رکھے تھے۔

حضورؐ کے کردار سے گھر کے لوگ اور آپ کے قریب ترین عزیز بھی اتنے متاثر تھے کہ وہ آپ کے لیے نبوت کو بھی بعید نہیں سمجھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ حضرت خدیجہ کوئی کم عمر خاتون نہ تھیں اور وہ حضورؐ کے ساتھ پندرہ سال گزار کر آپ کے کردار کے ہر پہلو سے خوب خوب آگاہ تھیں۔ اور غارِ حرا کے واقعہ نے اُن کے ذہن کو حضورؐ کے بارے میں کسی بُرائی کی طرف نہیں بلکہ ایک بلند ترین منصب کی طرف موڑ دیا۔ ورقہ بن نوفل بھی ایک عمر رسیدہ جہاں دیدہ انسان تھے اور حضورؐ کی ساری عمر اُن کے سامنے مکہ میں گذری تھی۔ اُن کے لیے بھی حضورؐ کے کردار کے ساتھ آن پر ناموسِ الٰہی کا اُترنا کوئی بعید از قیاس بات نہ تھی۔

حضورؐ کے بلند کردار نے آپ کی ذات میں رعب و ہیبت کا عنصر بھی پیدا کر دیا تھا۔ جیسا کہ حضورؐ نے خود فرمایا تھا کہ مجھے اپنے دشمنوں کے مقابلے میں ایک ماہ کی مسافت تک رُعب سے مدد دی گئی ہے۔ اس بات کا تجربہ ہر شخص کو ہے کہ بلند کردار اپنے اندر عظمت و ہیبت دونوں رکھتا ہے۔ یعنی بلند اخلاق اور اعلیٰ درجے کی دیانت و پاکیزگی و شرافت پر مبنی کردار ہمیشہ اپنے اندر زبردست طاقت اور قوت رکھتا تھا جس کے سامنے وہ حالات میں بولنے کی مجال بڑے بڑے کٹر کافروں کو بھی نہیں تھی۔ صحابہ کرام کے بارے میں تو یہ کہا ہی جاتا ہے کہ وہ حضورؐ کی مجلس میں زور سے آواز نہ نکالتے تھے اور دم بخود بیٹھتے تھے جیسے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں۔ مسلمان تو خیر مطیع فرمان لوگ تھے خود ابو جہل جیسے شدید دشمن کو بھی بعض اوقات مجرم ضمیر کے ساتھ بولنے کی مجال نہ ہوتی تھی۔ مشہور واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ اراشہ نام کا ایک شخص کچھ اونٹ فروخت کرنے کے لیے مکہ شہر لے آیا اور ابو جہل نے سودا کر کے اونٹ لے لیے لیکن قیمت ادا کرنے میں مسلسل کئی روز تک ٹال مٹول کرتا رہا۔ وہ شخص کئی قریشی سرداروں کے پاس مدد کے لیے گیا۔ اور فریاد کی کہ میں ایک بیکس مسافر ہوں۔ میرا حق مارا گیا ہے مجھ کو ابو الحکم سے میرا حق دلا دو۔ لیکن کسی میں ابو جہل سے کہنے کی جرأت نہ تھی۔ ان سرداروں میں سے کسی ایک نے ازراہِ مذاق حضور اکرمؐ کی طرف اشارہ کر دیا کہ ان سے کہو۔ یہ تیرا حق دلوا دیں گے۔ وہ

ناواقف شخص حضورؐ کے پاس جا کر فریادی ہوا۔ حضورؐ سارا قصہ سن کر اٹھ کھڑے ہوئے اور کہا کہ "میرے ساتھ آؤ"۔ قریش کے سردار خوب دلچسپی سے یہ تماشا دیکھنے لگے۔ حضورؐ نے ابوجہل کا دروازہ کھٹکھٹایا۔

"کون" اندر سے آواز آئی۔

"میں ہوں محمدؐ۔ باہر آؤ" حضورؐ نے فرمایا۔

اندر سے ابوجہل برآمد ہوا۔ لیکن اس کا رنگ فق تھا۔ آپؐ نے فرمایا "اس شخص کو اس کا حق فوراً ادا کردو"۔ ابوجہل خاموشی کے ساتھ اندر گیا اور قیمت لا کر مسافر کے ہاتھ پر گن کر رکھ دی۔ اراشی نے خوشی خوشی واپس آکر یہ سارا قصہ قریش کو سنایا۔ تھوڑی دیر بعد ابوجہل بھی آگیا تو لوگوں نے خوب مذاق اڑایا "تجھے کیا ہوگیا تھا۔ ہم نے تو ایسا کوئی نہیں دیکھا۔ یہ تو نے کیا کیا" سب نے کہا۔ ابوجہل نے کہا۔ "کم بختو، جب اس نے میرا دروازہ کھٹکھٹایا اور میں نے اس کی آواز سنی تو رعب اور رہیبت سے میری حالت لکڑی کے ایک پتلے جیسی ہوگئی تھی"۔

حضورؐ کے کردار کی بلندی اور صداقت و پاکیزگی کا یہ عظیم ترین نمونہ تھا کہ نبوت کا اعلان کرنے کے بعد بھی قریش نے انتہائی مخالفت اور مزاحمت کے باوجود کبھی آپؐ کو جھوٹا نہیں کہا اور آپ پر یہ الزام کبھی نہیں لگایا کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں۔ انہوں نے جس امر کی تکذیب کی وہ آپ کی نبوت کی حیثیت کی تھی۔ حضرت علیؓ کی روایت ہے کہ ایک بار حضورؐ کے سب سے بڑے دشمن ابوجہل نے دوران گفتگو حضورؐ سے کہا:-

"ہم آپ کو تو جھوٹا نہیں کہتے۔ مگر جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں اُسے جھوٹ قرار دیتے ہیں"

چنانچہ جنگِ بدر کے موقعہ پر اسی ابوجہل سے ایک شخص اخنس بن شریق نے تنہائی میں پوچھا "یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی تیسرا تو موجود نہیں ہے۔ سچ سچ بتاؤ کہ تم محمدؐ کو سچا کہتے ہو یا جھوٹا۔ ابوجہل نے جواب میں کہا۔ "خدا کی قسم، محمدؐ ایک سچا آدمی ہے۔ اس نے عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ مگر جب سقایت اور حجابت اور نبوت سب کچھ بنی قصی ہی کے حصے میں آجائے تو بتاؤ باقی سارے قریش کے پاس کیا رہ گیا"۔

حضورؐ کے اسی کردار کی معجزاتی عظمت کی بنا پر قرآن نے حضورؐ اور اسلام کے مخالفین کو چیلنج دیا۔

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ

میں یہ قرآن پیش کرنے سے پہلے تمہارے درمیان ایک عمر گذار چکا ہوں۔

گویا حضورؐ کا کردار اس شان کا تھا کہ اُسے نبوت کی صداقت کے لیے بطور گواہ کے منکرینِ قرآن کے سامنے پیش کیا جاسکتا تھا اور کسی کی مجال نہ تھی کہ وہ حضورؐ کی چالیس سالہ زندگی میں سے کوئی ایک واقعہ بھی جھٹلانے کے

لیے دلیل کے طور پر پیش کر سکے۔ حضورؐ ابتدا سے ہی اخلاق و کردار و عادات میں ہر ایک سے مختلف، ممتاز اور منفرد نظر آتے تھے۔ جھوٹ، بدکلامی، گالی و فحش بات کسی نے کبھی آپ کی زبان سے نہ سنی تھی۔ وہ لوگوں سے ہر قسم کے معاملات کرتے تھے۔ مگر آپ کی کسی کے ساتھ بھی تلخ کلامی اور تُو تُو مَیں مَیں کبھی نہ ہوئی تھی۔

آپ کی زبان میں ایسی شیرینی تھی کہ ہر کوئی آپ کا گرویدہ ہو جاتا تھا۔ آپ نے کبھی کسی سے حق تلفی نہیں کی۔ برسوں تک تجارت کرنے کے باوجود کسی کا ایک پیسہ بھی کبھی ناجائز طریقے سے نہیں لیا۔ جن لوگوں سے آپ کا معاملہ پیش آیا وہ آپ کی دیانت، امانت اور شرافت کے معتقد پائے گئے۔ ساری قوم آپ کو امین کہتی تھی۔ دشمن تک آپ کے پاس اپنی امانتیں رکھواتے تھے۔ اور اُن امانتوں کی بھی حفاظت کی جاتی تھی۔ بے حیا لوگوں کے درمیان آپ شرم و حیا کا مجسمہ تھے۔ بداخلاقوں کے درمیان آپ اخلاق کے اعلیٰ ترین درجے پر فائز تھے۔ بدکاروں کے درمیان آپ عصمت و عفت اور پاکیزگی و طہارت کا بہترین نمونہ تھے۔ آپ نے کبھی شراب اور جوئے کو ہاتھ نہیں لگایا۔ غیر شائستہ لوگوں کے ساتھ بھی آپ ہمیشہ شائستگی سے پیش آتے۔ بدتمیزوں سے بھی آپ ہمیشہ نرمی اور کرم گستری کا رویّہ رکھتے۔ سنگدلوں سے نرمی برتتے۔ ہر کسی کے دکھ درد میں شریک ہوتے۔ یتیموں، بیواؤں، بے کسوں، محتاجوں، فقیروں اور بے نواؤں کی مدد کرتے۔ آپ کسی کو دکھ نہ دیتے جب کہ خود دوسروں سے دکھ اٹھاتے۔ جھگڑالو لوگوں کے درمیان آپ صلح پسند تھے۔ عناد و خونریزی کرنے والوں کے درمیان آپ امن پسند تھے۔ مصالحت اور خدمت میں آپ پیش پیش ہوتے۔ بُت پرستوں کے درمیان آپ خدائے واحد کے پرستار تھے۔ اور کسی مخلوق کے آگے سر جھکانے کو تیار نہ تھے۔ اس سارے تنگ و تاریک اور متعفن ماحول میں حضورؐ کا کردار ایک ہیرے کی طرح چمکتا اور ایک پھول کی طرح مہکتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔

یہ معجزۂ کردار تھا جو اسلامی انقلاب کی دعوت کے لیے حضورؐ کے پاس ایک مؤثر ہتھیار تھا۔ اس ہتھیار کی موجودگی میں مخالفوں کے دل دشمنی میں بھی اندر سے مرعوب اور جھکے ہوئے تھے اور اُن کے لیے کھل کر بے دھڑک دشمنی کرنا سخت دشوار کام تھا۔ اس کردار کی حق پرستانہ کاٹ سے اپنے ضمیر کو صاف بچا کر لے جانا اور اس میں دعوتِ حق کی تخم ریزی نہ ہونے دینا اُن کے بس سے باہر تھا۔ حضورؐ کے کردار کا یہ عظیم انقلاب آفرین ہتھیار دعوتِ حق کے مخاطب لوگوں پر بڑا اثر انداز ہوتا تھا اور حضورؐ کے کردار کی پُرزور بارش سے سعید فطرت لوگوں کے دلوں کی کھیتیاں سرسبز ہوتی چلی جاتی تھیں۔

اسلام کا شورائی نظام

از جناب پروفیسر محمد یوسف فاروقی صاحب

یہ بات ماہرینِ عمرانیات کے ہاں مسلّم ہے کہ انسان طبعاً اجتماعیت پسند ہے، بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ انسان کا وجود ہی اجتماعیت کا مرہونِ منت ہے، جب کچھ افراد مل جل کر رہتے ہیں تو لازمی طور پر زندگی کے معاملات میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرتے ہیں۔ پریشانیوں میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور مشکلات دور کرنے میں مدد کرتے ہیں۔ اسی طرح خوشی و مسرت کے مواقع پر بھی ایک دوسرے کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں۔ قدیم دور سے یہ دستور چلا آرہا ہے۔

جوں جوں انسانی تمدن ترقی کرتا گیا، انسانی شعور کو جلا ملتی رہی، تجربات میں وسعت اور علم و فکر میں گہرائی پیدا ہوتی تو اسی اعتبار سے اجتماعیت پیدا ہوتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ انسانی معاشرہ خاندانی قبائلی اور علاقائی نظام کے مدارج طے کرتا ہوا قومی اور ملی نظام کی انتہائی ترقی یافتہ تنظیم میں داخل ہو گیا۔ اسی اجتماعی نظم کی بدولت دنیا میں منظم معاشرتی ادارے، بڑی بڑی سلطنتیں اور حکومتیں قائم ہوتی رہیں۔

انسانی تنظیم اور اجتماعیت کا تمام تر دارومدار لوگوں کے باہمی اعتماد و تعاون پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے معاشرتی تنظیم کے لیے ایسے اصول مرتب کر دیے ہیں، جو پُرخلوص اعتماد کی فضا کو بحال کر کے لوگوں کو باہمی تعاون پر آمادہ کرتے ہیں۔ ان اصولوں میں ایک اہم ترین اصول "شوریٰ" ہے۔ یہ اصول مسلم معاشرہ کے چھوٹے بڑے تمام اداروں میں کارفرما رہتا ہے۔ قرآن و سنّت نے مسلمانوں کے اجتماعی معاملات میں مشورہ کو واجب قرار دیا ہے۔ مسلمانوں کے تمام ادارے شورائی نظم کے تحت کام کرنے کے پابند ہیں، خواہ وہ معاشرتی ادارے ہوں یا اقتصادی یا سیاسی۔

قرآن و سنّت میں انسانی زندگی سے متعلق بہت سے احکام واضح طور پر بیان کر دیے گئے ہیں۔

حقوق اللہ سے متعلق تفصیلات بھی مہیا کر دی گئی ہیں، حقوق العباد سے متعلق بھی جامع ہدایات ملتی ہیں۔ لیکن اُمّتِ مسلمہ کی اجتماعی زندگی سے متعلق اُصولی ہدایات دے کر آزاد چھوڑ دیا گیا ہے تاکہ اُن حدود میں رہتے ہوئے ہر دَور اور ہر علاقہ میں اپنی ضروریات اور حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے تفصیلات طے کر لی جائیں، خاص طور پر نظمِ مملکت اور سیاسی نظم سے متعلق تفصیلات اور فروعی احکام شریعت نے طے نہیں کیے، بلکہ اس قسم کے تمام معاملات کے لیے معاشرے کو شورائی نظم کا پابند کر دیا ہے۔

قرآنِ حکیم نے شورائی نظم کا دو جگہ ذکر کیا ہے۔ پہلے اس کا حکم مکّی زندگی میں سورۂ شوریٰ میں نازل ہوا۔ یہ مکی دَور کا آخری زمانہ تھا جب مسلمان ایک جماعت اور تنظیم کی صورت اختیار کر رہے تھے۔ لہٰذا اُنہیں بنیادی عبادات کے ساتھ ساتھ اُن ضروری ہدایات سے بھی مطلع کیا جا رہا تھا جن کی انہیں اجتماعی نظم کے لیے ضرورت تھی۔ سورۂ شوریٰ کی آیت ۳۸ میں شوریٰ کا ذکر ہے لیکن اس کی اہمیت اور صحیح مفہوم سمجھنے کے لیے آیت نمبر ۳۷ سے مطالعہ ضروری ہے جہاں سے مضمون کا آغاز ہوتا ہے۔

وَالَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ۔

(ترجمہ) اور وہ بچتے ہیں بڑے گناہوں اور کھلی بے حیائیوں سے، اور جب غصہ ہوتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں۔ اور جنہوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہا، اور نماز کا اہتمام کیا اور اُن کا نظام شوریٰ پر ہے اور جو کچھ ہم نے اُن کو رزق بخشا ہے اُس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

(الشوریٰ ۳۷، ۳۸)

پہلی آیت میں گناہ کبیرہ، فواحش اور غصہ کی حالت میں بے قابو ہو کر اعتدال سے تجاوز کر جانے یا اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدود سے باہر نکل جانے کی ممانعت ہے۔ اگلی آیت میں اہلِ ایمان کے ان اوصاف کا ذکر ہے جو اُن کے دین کا لازمی حصہ ہیں مثلاً اقامتِ صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ۔ اس آیت مبارکہ میں دین کے دو بنیادی ارکان اقامتِ صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کے درمیان نظمِ شوریٰ کو بیان کیا ہے جس سے اس کی اہمیت واضح ہو رہی ہے۔

اِس آیت کی تفسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب نے ایک خوبصورت نکتہ بیان کیا ہے۔

وہ یہ کہ قرآن حکیم کا معروف اسلوب تو یہ ہے کہ اقامتِ صلوٰۃ کے ساتھ زکوٰۃ یا انفاق کا ذکر کرتا ہے۔ لیکن یہاں معروف طریقہ کے خلاف اقامتِ صلوٰۃ اور انفاق کے درمیان شوریٰ کا ذکر کیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نماز کی صورت میں ہمارا پورا نظم اجتماعی متشکل کر کے دکھایا ہے اور اس آیت کے اسلوب میں یہ بتایا ہے کہ ہم اپنی سیاسی تنظیم میں بھی اسی نمونہ کی پیروی کریں۔ اور اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ کے دین کی اقامت کے لیے اپنی تنظیم کریں، اپنے اندر سے سب سے اہل اور صاحبِ علم و تقویٰ کو اپنی قیادت کے لیے منتخب کریں۔ پھر تمام معروف میں بے چون و چرا اس کی اطاعت کریں اور اگر اس سے کوئی ایسی بات صادر ہو جو شریعت کے معروف کے خلاف ہو تو بے خوف لومۃ لائم اس کو متنبہ کر کے اس کو صحیح راہ پر لانے کی کوشش کریں۔[1]

حافظ ابن کثیر جو نہ صرف مفسر و محدث تھے بلکہ فقہ پر بھی گہری نظر رکھتے تھے اور شافعیؒ مدرسۂ فکر کے عظیم فقیہ تھے، اس آیت کی وضاحت میں لکھتے ہیں:

اَیْ لَا یُبْرِمُوْنَ اَمْرًا حَتّٰی یَتَشَاوَرُوْا فِیْهِ لِیَتَسَاعَدُوْا بِاٰرَآئِهِمْ

یعنی یہ لوگ کوئی قطعی فیصلہ اس وقت تک نہیں کرتے جب تک باہمی مشورہ نہ کر لیں تاکہ سب لوگوں کی آراء سے تقویت حاصل ہو۔[2]

"لَا یُبْرِمُوْنَ اَمْرًا" کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ابن کثیر کی رائے میں کسی بھی معاملہ میں بھی کوئی قطعی فیصلہ مشورہ کے بغیر نہیں کیا جاتا ہے۔ ابوحیان شوریٰ کے تین فوائد کا ذکر کرتے ہیں۔ اجتماع الکلمۃ، والتحاب، والتعاضد علی الخیر۔ یعنی باہمی اتفاق، محبت اور بھلائی کے کاموں میں ایک دوسرے کی بھرپور مدد۔ ان تین فوائد کا ذکر کرنے کے بعد وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے عمل کو بتاتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے بعد خلفاء معاملاتِ زندگی سے متعلق فیصلے مشورہ سے کرتے تھے۔ صحابہ کرام تو ان احکام میں جن کے بارے میں قرآن و سنت میں کوئی واضح حکم نہیں ملتا وہ بھی مشورہ سے طے کرتے تھے، مثلاً قتلِ مرتد، حربی کی میراث

---

[1] امین احسن اصلاحی، تدبر قرآن، ج ۶ ص ۱۷۹، ۱۸۰۔

[2] ابن کثیر، اسماعیل بن عمرو، تفسیر القرآن العظیم، ج ۴ ص ۱۱۸۔

اور شراب نوشی پر کوڑوں کی تعداد وغیرہ۔[1]

امام رازی بھی اس آیت کی تفسیر میں مشورہ کی اہمیت کا ذکر کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ صحابہ کرامؓ کا اس پر اتفاق تھا کہ مشورہ ضرور کیا جائے، وہ صحابہ کرام کا عمل یہ بتاتے ہیں:

لا ينفردون برأي بل ما لم يجتمعوا عليه لا يقدمون عليه

یعنی وہ انفرادی رائے کو اہمیت نہیں دیتے تھے اور عمل درآمد نہیں کرتے تھے۔[2]

ابو السعود العمادی حنفی مرحوم بھی اس آیت کی تفسیر میں یہی لکھتے ہیں کہ صحابہ کرام اس بات پر متفق تھے کہ انفرادی رائے کے بجائے اجتماعی فیصلے کیے جائیں۔[3]

جصاص اس آیت مبارکہ کے اسلوب بیان کی طرف توجہ دلاتے ہیں اور یہ فیصلہ صادر فرماتے ہیں کہ "ويدل على انها مامورون بها" یعنی (قرآن حکیم کا) یہ اسلوب دلالت کرتا ہے کہ یہ لوگ مشورہ کے لیے مامور تھے۔[4]

علامہ آلوسی مرحوم اور شوکانی مرحوم بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔[5]

ہم نے تمام مفسرین کرام کی آراء و تفاسیر کا سورۂ شوریٰ کی آیت نمبر ۳۸ کے بارے میں ذکر کیا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام کا نظم شوریٰ پر اجماع ہے اور یہ اجماع قرآن حکیم کی تعلیم کے عین مطابق ہے۔

مکی دور کے آخر میں جب یہ حکم نازل ہوا اس وقت مسلمان ایک جماعتی تنظیم کی حیثیت سے ابھر آئے تھے۔ یہ تنظیم مکہ مکرمہ کے اس قبائلی نظام سے مختلف تھی جس میں مضبوط خاندانوں کو نمایاں حیثیت

[1] ابو حیان، اثیر الدین، ابو عبد اللہ، البحر المحیط جلد ۷، ص ۵۲۲

[2] الفخر الرازی، التفسیر الکبیر جلد ۲۷ ص ۱۷۷۔

[3] السعود، محمد بن محمد العمادی، ارشاد العقل السلیم الی مزایا القرآن الکریم جلد ۵ ص ۳۶۔

[4] ابوبکر جصاص، احکام القرآن جلد ۳ ص ۴۰۵

[5] آلوسی، سید محمود شکری، روح المعانی جلد ۲۵، ص ۴۵ تا ۴۶ — اور الشوکانی محمد بن علی بن محمد، فتح القدیر جلد ۴ ص

حاصل ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی تعداد ابھی چند سو تھی، اُن کے لیے کلمہ جامعہ صرف اسلام تھا۔ دین کی بنیاد پر اس اتحاد و یکجہتی کی قوت نے اہلِ قریش کے لیے بہت سی مشکلات اور الجھنیں پیدا کر دی تھیں۔ پہلے حبشہ میں مسلمانوں کا اجتماع اور پھر وہاں مملکتِ مکہ کی سفارت کی ناکامی نے اہلِ مکہ کو خاصا بوکھلا دیا تھا۔ قریش نے خاندانِ بنو ہاشم کا معاشرتی مقاطعہ کیا۔ اس مقاطعہ سے بھی وہ مقاصد حاصل نہ کر سکے جو وہ چاہتے تھے۔ دوسری طرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعوتِ دین کے کام کے ساتھ بیرونی وفود کے ساتھ بھی رابطے قائم کرنا شروع کر دیے تھے اور اُن کے ساتھ دفاعی و سیاسی معاہدات کے لیے مذاکرات کر رہے تھے۔ اس دور میں اُمتِ مسلمہ عرب معاشرہ میں ایک اجتماعی و سیاسی شکل میں منظم ہو رہی تھی۔ اور اس ملت کا ہر فرد اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے بھرپور کردار ادا کرنے کے لیے پوری طرح تربیت پا چکا تھا۔ اُس وقت انہیں اس بات کا پابند کر دیا گیا کہ اب اجتماعی معاملات باہمی مشورہ سے طے کر کے اُن پر عمل درآمد کریں۔

دوسری آیت سورۂ آلِ عمران کی ہے۔ آیت یہ ہے:۔

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ ۚ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ

(ترجمہ) یہ اللہ کا فضل ہے کہ آپ اُن کے لیے نرم خو ہیں۔ اگر آپ درشت خو اور سخت دل ہوتے تو آپ کے پاس سے یہ منتشر ہو جاتے۔ سو اُن سے درگزر کرو، اُن کے لیے مغفرت چاہو، اور معاملات میں اُن سے مشورہ لیتے رہو۔ پس جب تم فیصلہ کر لو تو اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرو۔ بے شک اللہ تعالیٰ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے

(آلِ عمران ۔ ۱۵۹)

یہ سورہ مبارکہ مدنی دور میں نازل ہوئی، اس سورہ کا آخری حصہ جس میں مشورہ کا حکم ہے۔ اس کا زمانہ نزول غزوۂ احد کے بعد کا زمانہ ہے۔ جنگِ اُحد شوال ۳ھ میں لڑی گئی۔ اس موقع کی صورتِ حال یہ ہے کہ مسلمان مدینہ منورہ میں ایک اسلامی مملکت قائم کر چکے ہیں۔ مسلمانوں میں باہمی جذبۂ اخوت و محبت پوری طرح مستحکم ہے۔ اُن کے عقائد راسخ ہیں اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کی وجہ سے انہیں برتری

حاصل رہے۔ اُدھر کفار جنگِ بدر میں شکست کھا چکے تھے۔ غزوۂ اُحد میں انہیں کچھ کامیابیاں بے شک حاصل ہوئی تھیں، لیکن مسلمانوں کے عزائم بلند تھے، انہوں نے حمراء الاسد تک کفار کا تعاقب کر کے انہیں یہ احساس دلا یا تھا کہ حقیقت میں مسلمانوں کو شکست نہیں ہوئی۔ یہودیوں کے ایک قبیلہ بنو قینقاع کو اُس کی بدعہدی کی وجہ سے سرزمینِ مدینہ سے نکال دیا گیا تھا۔ مدینہ منورہ کے اطراف میں آباد بعض قبائل سرکشی اور بغاوت پر آمادہ تھے۔ اِن بغاوتوں کو ختم کرنے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف مقامات پر لشکروں کو روانہ فرمایا تھا جو دشمنوں کے ساتھ برسرِ پیکار تھے۔

یہ وہ دَور ہے جب نقشۂ عالم پر ایک اسلامی مملکت کے نقوش اُبھر رہے تھے۔ اسلام کے غلبہ اور اس کی صداقت کے آثار اتنے نمایاں ہو چکے تھے کہ اہلِ کتاب کے لیے کھل کر مخالفت کرنا ممکن نہیں رہا تھا۔ قریشِ مکہ اور عرب کے دیگر مشرک قبائل بھی یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ مسلمانوں کو ختم کرنا کوئی معمولی یا آسان کام نہیں۔ اِن حالات میں بعض انتظامی اور سیاسی معاملات میں رہنمائی کے لیے احکام نازل ہوئے۔ اسی سلسلہ کی ایک آیت یہ ہے جسے ہم نے اُوپر ذکر کیا ہے۔

اِس آیت کی تفسیر میں علامہ نیشاپوری مرحوم (۷۲۸ھ) نے بہت سے اہم علمی نکات بیان کیے ہیں۔ ہم یہاں اُن کا خلاصہ بیان کر رہے ہیں۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ساری امت میں سب سے زیادہ علم والے اور فکر و نظر کے اعتبار سے سب سے بہتر تھے۔ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انہیں صحابہ کرام سے مشورہ کرنے کا حکم دیا۔ اس کے بہت سے فوائد تھے، مثلاً یہ کہ اس سے خود صحابہ کرام کی عظمت واخلاص اور بلندیٔ مرتبت کا اظہار ہوتا ہے۔

انسانی علوم متناہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص کے دل و دماغ میں جو بات آئے وہ دوسروں کے دل میں نہ آئے، مشورہ کر کے سب کی رایوں سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

حضرت حسن اور سفیان بن عُیَینہ فرماتے ہیں کہ اگرچہ رسول اللہ کو مشورہ کی کوئی خاص ضرورت نہ تھی۔ لیکن انہیں اس لیے مشورہ کا حکم دیا گیا تھا کہ آپ کی زندگی بعد والوں کے لیے اُسوۂ حسنہ قرار دی گئی ہے۔

غزوۂ اُحد میں اگرچہ لوگوں نے مشورہ دینے میں غلطی کی تھی، لیکن اس کے باوجود مشورہ کا

حکم باقی رہا تاکہ انہیں معلوم ہو کہ رسول اللہ کے دل میں اس واقعہ کا کوئی اثر نہیں ہے۔

مشورہ سے لوگوں کے علم اور فکر کی گہرائی کا بھی اندازہ ہوجاتا ہے، تاکہ پھر اُن کے ساتھ اُن کے علم و فکر کے مطابق سلوک کیا جاسکے۔[1]

ایک فائدہ یہ ہے کہ پاکیزہ نفوس اور صالح رائے میں عملی تطابق ہوجاتا ہے جو حصولِ مقصد میں کامیابیوں سے ہم کنار کرتا ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے " ما تشاور قوم قط الا ھدوا لارشد امرھم " لوگ جب باہمی مشورہ سے کام کرتے ہیں تو انہیں ضرور صحیح راستہ کی رہنمائی ہوتی ہے۔ جمعیت و تنظیم کا سارا راز اسی میں پوشیدہ ہے۔[1]

ابوحیان اندلسی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ رسول اللہ کو مشورہ کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ باہمی مشاورۃ کو قانونی حیثیت حاصل ہوجائے اور آپ کے بعد لوگ ان تمام معاملات میں جہاں وحی خاموش ہے رائے اور مشورہ سے عمل کریں۔[2] (باقی)

---

[1] حسن بن محمد، نظام الدین، نیشاپوری۔ غرائب القرآن و رغائب الفرقان جلد ۴ ص ۱۰۸۔

[2] ابوحیان، محمد بن محمد۔ اسیرالدین البحر المحیط جلد ۳ ص ۹۸

احتیاط

ترجمان القرآن میں ضرورتِ استدلال کے لیے آیات و احادیث شائع ہوتی رہتی ہیں۔ قارئین سے گزارش ہے کہ جن اوراق پہ آیات و احادیث ہوں۔ ان کا خاص احترام ملحوظ رکھیں تاکہ بے ادبی نہ ہونے پائے۔

ادارہ

برصغیر پاک و ہند میں اشاعتِ علمِ حدیث

جناب عبدالرشید عراقی صاحب

علمِ حدیث وہ علم ہے جس کے ذریعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و احوال اور افعال جانے جائیں۔ علمِ حدیث کی اس تعریف سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ فنِ حدیث کا موضوع آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔ اس علم کی غرض و غایت دنیاوی اور اُخروی سعادت کی تحصیل ہے۔ احکامِ شرعیہ اور فقہیہ میں کتاب اللہ کے بعد حدیث شریف حجت ہے۔ اس علم کے اصول و احکام اور اس کے قواعد و ضوابط اور اصطلاحات کو علمائے کرام اور محدثین و فقہاء نے بڑی وضاحت و تفصیل سے بیان فرمایا ہے۔ یہاں صرف مولانا سید سلیمان ندوی (م ۱۹۵۳ء) کا ایک ارشاد پیش کیا جاتا ہے۔

علم القرآن اگر اسلامی علوم میں دل کی حیثیت رکھتا ہے تو علم حدیث شہ رگ کی۔ یہ شہ رگ اسلامی علوم کے تمام اعضاء و جوارح تک خون پہنچا کر ہر آن آن کو تازہ زندگی کا سامان پہنچاتا رہتا ہے۔ آیات کا شانِ نزول اور ان کی تفسیر، احکام القرآن کی تشریح و تعیین، اجمال کی تفصیل، عموم کی تخصیص، مبہم کی تعیین، سب علم حدیث کے ذریعہ معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح حاملِ قرآن حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور حیاتِ طیبہ اور اخلاق و عاداتِ مبارکہ اور آپ کے اقوال و اعمال اور آپ کے سنن و مستحبات اور احکام و ارشادات اسی علم حدیث کے ذریعہ ہم تک پہنچے ہیں۔ اسی طرح خود اسلام کی تاریخ، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے احوال اور ان کے اعمال و اقوال اور اجتہادات و استنباطات کا خزانہ بھی اسی کے ذریعے ہم تک پہنچا ہے۔ اس بنا پر اگر کہا جائے تو صحیح ہوگا کہ اسلام کے عملی پیکر کا صحیح مرقع اسی علم کی بدولت مسلمانوں

ہیں ہمیشہ کے لیے موجود و قائم ہے اور انشاء اللہ تا قیامت رہے گا۔[1]

حدیث کی اشاعت اور اس کی جمع و تدوین کی ابتدا کی تفصیل یہ ہے کہ چونکہ یہ علم احکام شرعیہ کے بنیاد اور اس کے اصول کی حیثیت رکھتا ہے، اس لیے ثقہ علماء نے اس کی طرف بہت زیادہ اہتمام اور توجہ کی ہے۔ جاننے والوں نے اس کو ایک دوسرے سے روایت و نقل کرنا شروع کیا۔ صحابہ و تابعین کے نزدیک اس علم سے افضل کوئی علم نہیں۔ اس لیے تمام لوگوں نے اس کی طرف توجہ کی اور جو جس قدر احادیث نبویہ کا حافظ و عالم تھا، اسی قدر لوگوں کی نظروں میں زیادہ محترم و معزز ہوتا۔ اس کے نتیجہ میں اس علم کے حصول میں لوگوں کی دلچسپیاں بڑھ گئیں۔ اور اس کی تحصیل کا اتنا اہتمام ہونے لگا کہ لوگ سینکڑوں میل دشوار گذار اور خطرناک راستوں کو طے کرتے تھے، تاکہ کسی حافظ حدیث سے ایک ایک حدیث سن کر یاد کرلیں۔

ابتدا میں احادیث نبویہ کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی گئی، کیونکہ عملاً احادیث کے احکام کا اجرا اور حکمت کا فروغ ہو رہا تھا۔ مگر جب اسلامی فتوحات کا دائرہ وسیع ہو گیا اور صحابہ کرام مختلف شہروں میں پھیل گئے اور وہ دنیا سے اٹھنے لگے تو علمائے امت نے کتابت حدیث کی طرف توجہ کی۔ اور سب سے پہلے اموی خلیفہ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ (م سنہ ۱۰۱ھ) نے علمائے وقت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی کہ حدیث شریف کی جمع و تدوین کی جائے۔ چنانچہ آپ نے ابوبکر محمد بن عمرو بن حزم کے ذمہ یہ کام کیا اور انہوں نے حدیث شریف کو مدون کیا۔[2]

علم حدیث ہندوستان میں

ہندوستان میں علم حدیث کی اشاعت دسویں صدی ہجری سے شروع ہوئی۔[3] عرب ممالک سے کئی مقتدر علمائے کرام ہندوستان آئے۔ اور ان کے ذریعہ یہ علم ہندوستان

---

[1] مقدمہ تدوین حدیث - از مولانا مناظر حسن گیلانی۔

[2] تدوین حدیث ایک علیحدہ مضمون ہے۔ اور یہاں صرف مختصراً اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ نفس مضمون سے اس کا کوئی تعلق نہیں (عراقی)

[3] ہندوستان میں علم حدیث اس سے پہلے۔ رواج پذیر ہو چکا تھا۔ مگر اس کی زیادہ اشاعت دسویں صدی ہجری سے ہوئی۔ (عراقی)

میں رواج پذیر ہوا۔

جن ممتاز علمائے کرام نے ہندوستان کی زمین کو شرف قبولیت بخشا۔ اُن میں سے چند ایک کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

شیخ عبدالمعطی بن حسن بن عبداللہ	متوفی بہ احمدآباد (۹۸۹ھ)
شہاب احمد مصری بن بدرالدین	متوفی بہ احمدآباد (۹۹۲ھ)
شیخ محمد فاکہی حنبلی بن علی	متوفی بہ احمدآباد (۹۹۲ھ)
شیخ محمد مالکی مصری بن محمد عبدالرحمن	متوفی (۹۱۹ھ)
شیخ رفیع الدین چشتی شیرازی	متوفی بہ اکبرآباد (۹۵۴ھ)
شیخ بہلول بدخشی خواجہ میر کلاں	متوفی بہ اکبرآباد (۹۸۱ھ) [1]

شیخ محمد بن طاہر پٹنی (م ۹۸۶ھ)

علم حدیث کی اشاعت کے سلسلہ میں شیخ محمد بن طاہر پٹنیؒ بہت اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اس سلسلے میں بہت کام کیا۔ آپ نے اس فن کا درس دیا اور بہت سے ممتاز علمائے کرام آپ سے مستفید ہوئے۔ آپ نے اس فن پر کتابیں بھی تصنیف فرمائیں مثلاً مجمع البحار حدیث کے غریب و مشکل الفاظ کی توضیح و تشریح میں ان کی ایک نادر کتاب ہے۔ مولانا سید عبدالحی (م ۱۳۴۱ھ) لکھتے ہیں کہ علم حدیث میں ان کو بہت دخل و توغل تھا۔ وسعت معلومات اور بالغ نظری میں ہندوستان میں ان جیسا کوئی محدث نہیں گزرا ہے۔[2]

شیخ محمد بن طاہر پٹنی کے علاوہ شیخ طاہر بن یوسف سندھی (م ۱۰۰۴ھ) بھی علمائے کرام میں سے تھے۔ جنہوں نے اشاعت حدیث کے سلسلوں میں برہان پور میں ایک مدت تک درس دیا اور بہت سے علمائے فن نے فن حدیث کی تکمیل ان سے کی۔

شیخ عبدالحق محدث دہلوی (م ۱۰۵۲ھ)

فن حدیث کی نشر و اشاعت کے لیے شیخ عبدالحق دہلوی بن سیف الدین بخاری (م ۱۰۵۲ھ) کا نام نامی سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہے۔ آپ نے

[1] اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں ص ۱۹۶

[2] ایضاً ص ۱۹۰

اپنی ساری کوشش و صلاحیت اس علم کی نشر و اشاعت پر صرف فرمائی۔ آپ نے نصف صدی سے زیادہ درس و تدریس اور ارشاد و تلقین کا ہنگامہ گرم رکھا۔ اور ان کا قلم عمر بھر قرآن و حدیث کے اسرار و حکم کی کشف و تحقیق میں گہر افشانی کرتا رہا۔

آپ کا سب سے بڑا کارنامہ ترویجِ علوم حدیث سے متعلق ہے۔ دارا شکوہ نے بجا طور پر ان کو "امامِ محدثانِ وقت" کہا ہے۔ خافی خان لکھتا ہے:۔

"درکمالاتِ صوری و معنوی، وتحصیلِ علومِ عقلی و نقلی خصوصِ تفسیر و حدیث در تمام ہندوستان ثانی نداشت"[1]

شیخ عبدالحق نے ایسے دور میں حدیث کی نشر و اشاعت کی طرف توجہ کی جب کہ شمالی ہندوستان میں علمِ حدیث تقریباً ختم ہوچکا تھا۔ آپ نے اس سلسلہ میں فارسی زبان کو اختیار بنایا اور فارسی میں حدیث کی شروح کر کے حدیث کو لوگوں سے روشناس کرایا۔ آپ کی اس کوشش کے متعلق مولانا ابوالکلام آزاد (م ۱۹۵۸ء) لکھتے ہیں:۔

"حضرت شاہ عبدالحق محدث جس دورِ علم و تعلم کے بانی ہوئے، اس کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ علمِ حدیث کے متعلق فارسی زبان میں جو ملک کی عام زبان تھی تصنیف و تالیف کی بنیاد ڈالی گئی"[2]

عربی سے فارسی میں ترجمہ کرنے میں شیخ محدث کو بڑی مہارت حاصل تھی۔ نواب صدیق حسن خان (م ۱۳۰۷ھ) لکھتے ہیں:۔

"در ترجمہ عربی بفارسی یکے از افراد ایں اُمت است۔ مثل او دریں کاروبار خصوصاً دریں روزگار احدے معلوم نیست"[3]

فنِ حدیث کی نشر و اشاعت میں آن کی جد و جہد اپنے پیش رووں سے اس قدر نمایاں ہیں کہ لوگوں

---

[1] حیات شیخ عبدالحق محدث ص ۲۸۳

[2] تذکرہ۔

[3] اتحاف النبلاء۔

یہاں تک کہہ دیا کہ فنِ حدیث کو ہندوستان میں سب سے پہلے لانے والے بھی شیخ عبدالحق محدث دہلوی ہیں۔

شیخ عبدالحق دہلوی نے حدیث کی کتابوں کے سلسلے میں جو خدمت کی ہے۔ اس کی تفصیل یہ ہے:۔

۱۔ اشعۃ اللمعات شرح مشکوٰۃ (فارسی)۔ حضرت شیخ نے یہ شرح ۱۰۱۹ھ میں دہلی میں شروع کی ۱۰۲۵ھ میں ۶ سال میں پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ یہ شرح چار جلدوں میں ہے۔[1]

۲۔ لمعات التنقیح فی شرح مشکوٰۃ المصابیح (عربی) یہ شرح بھی شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے فارسی شرح کے ساتھ ساتھ لکھی اور اس کی تکمیل بھی ۲۴ رجب ۱۰۲۵ھ کو ہوئی۔[2]

۳۔ جامع البرکات منتخب شرح مشکوٰۃ۔ یہ شرح دو جلدوں میں ہے۔ اس شرح کے متعلق حضرت شیخ فرماتے ہیں:۔

> "مجموعہ آمدہ است شامل فوائدِ کثیرہ وعوائد عزیزہ در ہر باب یک دو متن حدیث ذکر کردہ و باقی احادیث بر مضامین آن اختصار کردہ و اختصار نمودہ شدہ است"[3]

۴۔ اسماء الرجال والروایات المذکورین فی کتاب المشکوٰۃ۔ اس کتاب میں حضرت شیخ دہلویؒ نے مشکوٰۃ کے سب راویانِ حدیث کے نام یکجا کر دیے ہیں۔ شروع میں خلفائے راشدین کا ایک طویل تذکرہ ہے۔ اس کے بعد اہل بیت کا حال ہے۔ پھر راویانِ حدیث کے حالات حروف تہجی کی ترتیب سے لکھے گئے ہیں۔[4]

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی کے بعد ان کے صاحبزادے حضرت شیخ نورالحق (م ۱۰۷۳ھ) نے اس علم کی خدمت اور نشر و اشاعت کی ذمہ داری لی۔ آپ نے بھی اس سلسلہ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ آپ نے تیسیر القاری کے نام سے فارسی زبان میں بخاری شریف کی شرح لکھی۔ یہ شرح

---

[1] حیات شیخ عبدالحق ص ۱۶۵

[2] ایضاً ص ۱۶۸

[3] ایضاً ص ۱۷۰

[4] ایضاً ص ۱۷۱

مطبع نول کشور لکھنؤ سے شائع ہو چکا ہے[1]

حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی (م ۱۱۷۶ھ)

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی اور ان کے خانوادے کے بعد یہ خدمت خاندان ولی اللہی تک پہنچی۔ آپ جب حج بیت اللہ کے لیے تشریف لے گئے تو آپ نے حرمین میں حضرت شیخ ابوطاہر کردی مدنی سے حدیث کی سند لی اور حرمین شریفین سے واپسی کے بعد آپ نے اپنی ساری کوشش حدیث کی نشر و اشاعت پر صرف فرمائی۔ اس سلسلہ میں آپ نے مسند درس بچھائی۔ بہت سے ممتاز علمائے کرام مستفید ہوئے[2] اور اس کے ساتھ آپ نے حدیث کی اول الکتب مؤطا امام مالک کی دو شرحیں عربی و فارسی میں بنام المسوّی و المصفّٰی لکھیں[3]

حضرت شاہ ولی اللہ کے صاحبزادگان یعنی حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی (م ۱۲۳۹ھ)، حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلوی (م ۱۲۳۰ھ)، حضرت شاہ رفیع الدین محدث دہلوی (م ۱۲۳۳ھ) اور آپ کے پوتے حضرت شاہ اسمٰعیل الشہید دہلوی (م ۱۲۴۶ھ)، اور حضرت شاہ عبدالعزیز کے داماد مولانا شاہ عبدالحی بڈھانوی (م ۱۲۴۳ھ) ایسے بزرگ ہیں۔ جنہوں نے اپنے اپنے وقت میں علم حدیث کی نشر و اشاعت اور اس کی خدمت میں پورا حصہ لیا۔ مولانا سید عبدالحی (م ۱۳۴۱ھ) لکھتے ہیں:

> "جب تک ہندوستان میں مسلمان موجود ہیں، اس وقت تک ان بزرگوں کا شکر مسلمانوں پر واجب ہے۔ انہوں نے فن حدیث کی خدمت و اشاعت کر کے امت محمدیہ پر جو احسان کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے[4]"

ان علمائے کرام کے علاوہ مولانا شاہ محمد اسحاق محدث دہلوی (م ۱۲۶۲ھ)، شیخ عبدالغنی دہلوی بن ابو سعید (م ۱۲۹۶ھ) اور مولانا عبدالقیوم بن مولانا عبدالحی (م ۱۲۹۹ھ) بھی ہیں۔ جنہوں نے سنت نبوی کی اشاعت اور علم حدیث کو پھیلانے میں بڑی محنت صرف کی۔ ہندوستان میں حضرات فن حدیث میں کام تقسیم

---

[1] سیرت البخاری ص ۲۳۹

[2] اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں ص ۱۵۵

[3] ہندوستان میں اہلحدیث کی علمی خدمات ص ۲۰

[4] اسلامی علوم و فنون ہندوستان میں ص ۲۰۰

کیے جاتے ہیں۔

حضرت شاہ محمد اسحاق دہلویؒ کے نامور شاگردوں نے بھی حدیث کی نشر و اشاعت میں اہم کردار ادا کیا ہے اور انہوں نے وہ کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں کہ قیامت تک ان کا نام زندہ و درخشاں رہے گا۔ ان جلیل القدر تلامذہ کے نام یہ ہیں۔

مولانا احمد علی سہارنپوری (م ۱۲۹۷ھ)

مولانا عبدالرحمٰن انصاری پانی پتی (م ۱۳۱۴ھ)

مولانا سید عالم نگینوی مراد آبادی (م ۱۲۹۵ھ)

مولانا شیخ الکل سید نذیر حسین محدث دہلوی (م ۱۳۲۰ھ)

مولانا سید نذیر حسین محدث دہلوی نے حدیث کی نشر و اشاعت میں جو کارہائے نمایاں سرانجام دیے ہیں وہ سنہری حروف سے لکھنے کے قابل ہیں۔ آپ نے ۶۰ سال تک دہلی میں درس حدیث دیا۔ اور آپ کے علم سے اہل عرب و عجم کی بہت بڑی تعداد نے فائدہ اٹھایا۔

بیرون ہند سے یعنی کابل، یاغستان، بخارا، سمرقند، غزنی، قندھار، قوقند، ہرات، حجاز، نجد، الجزیرہ اور سوڈان سے طلبا آپ کے درس میں حاضر ہوئے اور حدیث سے مستفید ہوئے[1]

ہندوستان کے بہت سے اکابر علماء نے آپ سے استفادہ کیا، جن کی پوری فہرست درج کرنا یہاں ممکن نہیں۔

---

[1] ہندوستان میں علمائے اہل حدیث کی علمی خدمات ص ۲۱

قرآن کا موضوع اور نظمِ قرآن

جناب نعیم صدیقی صاحب

ایک نیا اور اجنبی آدمی جب قرآن کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو دو باتیں اس کی مشکلات کا باعث بنتی ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن اس طرز کی کتاب نہیں ہے کہ مصنف نے مقدمے میں پہلے یہ بتایا ہو کہ اس کا مرکزی موضوع و مقصد کیا ہے، پھر کتاب کے ابواب مرتب کیے ہوں، مثلاً عقائد یا ایمانیات کا باب، پھر عبادات کا باب، پھر دعوت و تبلیغ کا باب، پھر ہجرت اور جہاد کے ابواب، پھر دستور، سیاست اور نظامِ حکومت کے ابواب اور پھر قانون اور اخلاق کے ابواب، نیز آخر میں یا کسی مقام پر انبیائے سلف اور اقوامِ ماضیہ کے حالات۔

ابواب کے بعد پھر ان کی فصلیں ہوتیں، پھر ذیلی اور ضمنی عنوانات ہوتے۔ مگر قرآن کے ایک اجنبی طالب علم کو یہ سب کچھ اس طرح نہیں ملتا، بلکہ اسے محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بغیر کسی نظم کے متفرق باتیں بیان ہو رہی ہیں۔

دوسری مشکل اسے یہ پیش آتی ہے کہ دنیا کے مروجہ محدود تصورِ مذہب کو دماغ میں لیے ہوئے قرآن کے حدیقۂ اسرار و حکمت میں اس امید کے ساتھ داخل ہوتا ہے کہ یہاں بھی مذہبوں جیسی باتیں ہوں گی، یعنی کچھ مبہم عقیدے، کچھ انفرادی اخلاقیات، کچھ حیاتِ دنیوی سے نفرت کی باتیں، کچھ جسم کی اذیت رسانی کے اسالیب جن سے روحانیت حاصل ہوتی ہے، وغیرہ۔ مگر قرآن میں اس کو کہیں عروج و زوالِ امم کی داستانیں ملتی ہیں، کہیں اصولِ حکمرانی کا بیان آتا ہے، کہیں اجتماعی زندگی کے لیے قوانین اور ضابطے بیان ہوتے ہیں، اور کہیں جہاد کا حکم دیا جاتا ہے تو وہ چکرا سا جاتا ہے کہ یہ سب کیا ہے۔

یہ مشکل نئے اور اجنبی قاری ہی کی نہیں۔ پشتینی مسلمانوں میں سے بھی بہت سے حضرات اس مشکل

میں حصہ دار ہیں، اور خاص طور پر مجھے اس نوجوان طبقے کے متعلق احساس ہوتا ہے جو اسلامی نظام کے متعلق مختلف تقاریر سن کر اور مضامین پڑھ کر ایک نہ ایک دن بڑے شوق سے قرآن کھول کر حقائق کا براہِ راست مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔

قرآن مروجہ محدود تصورِ مذاہب سے کہیں زیادہ بڑی چیز پیش کرتا ہے۔ یہ دراصل مالکِ کائنات کی عطا کردہ ایک گائیڈ بک ہے۔ انسان کے نام جو خدا کی مخلوق ہے، اس کے رزق پر پلتا ہے، اس کے وسائل سے استفادہ کرتا ہے۔ اور اسی کا بندہ اور خلیفہ ہے۔ خدا نے اپنے بندوں کو بندگی کے مسلک پر رہنے اور خلافت کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے لیے ایک جامع ہدایت نامہ انہیں اس وعدے کے ساتھ تفویض کیا ہے کہ اس کے مطابق جیو گے اور حق کے غلبے کے لیے سعی و جہد کرو گے تو دنیا میں بھی تمہیں فلاح ملے گی اور آخرت میں بھی کامران رہو گے۔

یہ قرآن کا مرکزی موضوع ہے اور الحمد سے والناس تک یہ قرآن کے پورے جہانِ معنی کا محور ہے۔ مرکزی موضوع کا سرِرشتہ اگر ہاتھ آجائے تو پھر قرآن کے تمام اجزائے کلام مربوط بھی ہو جاتے ہیں اور ان سب کا مفہوم بھی نمایاں ہو جاتا ہے۔

اس مرکزی موضوع کی چند بڑی شاخیں ہیں جو قرآن کے ساری فضا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ قرآن کے بیان و کلام کا شجرۂ طیبہ جن بڑی بڑی شاخوں پر مشتمل ہے وہ یہ ہیں:

اوّل: خدا اور کائنات اور آخرت اور انسان کے بارے میں وہ اٹل سچائیاں جن کے سہارے ساری گفتگو کھڑی ہیں۔ **دوم**: سلسلۂ وحی و رسالت۔ **سوم**: خدا سے مطلوبہ تعلق رکھنے کے لیے عبادات، اذکار، دعائیں اور اخلاص و عجز کی کیفیات۔ **چہارم**: خدا کے دین کی دعوت دوسروں تک پہنچانے اور جوابًا صبر آزما حالات پیش آنے پر صبر و ثبات کی تلقین، پھر ہجرت اور جہاد کے مراحل پر گفتگو۔ **پنجم**: اخلاقی ہدایات۔ **ششم**: اسلامی جماعت کی تربیت اور رسولؐ کے ساتھ جماعت کا تعلق، نیز افرادِ جماعت کا آپس میں رشتۂ وحدت و اخوت۔ **ہفتم**: مخالفینِ دعوت کے اعتراضات کے جواب اور ان کا پست کردار۔ **نہم**: انبیائے ماسبق اور اقوامِ ماضیہ کے احوال کا ذکر اور اس سے استدلال و استشہاد۔ **دہم**: اسلامی نظامِ حکومت کی نقشہ بندی اور اسلامی قانون و شریعت کی وضاحت۔

ذرا سا غور کیجیے تو یہ دسیوں ضمنی موضوعات دراصل بنیادی موضوع سے بھی جڑے ہوتے ہیں، اور آپس میں بھی تعلق رکھتے ہیں۔ ایک کے بیان سے دوسرے کا ذکر چھڑتا ہے اور دوسرے کا ذکر تیسرے کے دائرے میں لے جاتا ہے۔ کہیں قانون بیان ہوتا ہے تو ساتھ ہی اخلاقی تلقین بھی ہے یا اساسی اعتقاد ------ اور جزا و سزا کی گفتگو۔ کہیں اسلامی جماعت کی تربیت کی بات چھڑتی ہے تو اس کے ساتھ انبیائے ماسبق کی مساعی کا ذکر آجاتا ہے۔ اسی طرح کہیں مخالفین و معاندین کی کٹ حجتیوں اور پست اخلاقیوں کا قصہ چھڑتا ہے تو ساتھ ہی سرکش قسم کی اقوام ماضیہ کا رویہ اور ان کا انجام بیان ہوتا ہے، کہیں احوال و واقعات کی بحث وحی و الہام کی دی ہوئی ہدایات کے میدان میں داخل ہو جاتی ہے اور کلام ظاہر کرتا ہے کہ فلاح انہی کے لیے ہے جو اس ہدایت پر چلیں۔

قرآن کے مرکزی موضوع کو آدمی سمجھ لے تو سمجھیے کہ نظم قرآن کا راز بڑی حد تک اس نے پالیا۔

اب ہم ذرا آگے چلتے ہیں۔ کسی کتاب یا کلام کا تصور نظم کے بغیر ہم کر ہی نہیں سکتے۔ فرق یہ ہے کہ نظم کی مختلف اقسام ہیں۔ ایک نظم وہ ہے جو مثنوی مولانا روم میں پایا جاتا ہے ---- ایک نظم وہ ہے جسے آپ ناولوں میں دیکھتے ہیں ---- ایک نظم وہ ہے جو کھیلوں کی کمنٹری میں پایا جاتا ہے ---- ایک نظم کسی ملک کی کتابِ دستور کا ہوتا ہے ---- ایک نظم طالب علم کی کورس کی کتاب کا ہے ---- پس مسئلہ یہ ہے کہ قرآن کے نظم کی نوعیت کیا ہے؟

میرے سامنے امام رازی سے لے کر مولانا فراہی تک جو مختلف آراء آئی ہیں، ان سب پر ایک نظر ڈالنے کے بعد صحیح یہ معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے کلام کا نظم خطابی قسم کا ہے۔ وہ ایسے الہامی خطبات کا مجموعہ ہے جو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے نشر ہوئے اور جن کا روئے سخن کہیں مسلمانوں کی طرف ہے، کہیں مشرکین یا یہود و نصاریٰ یا منافقین کی طرف، کہیں اظہارِ عبودیت کے لیے خود خدا کی طرف۔ خطبات میں بسا اوقات دو یا زائد اجزائے کلام مخاطب لوگوں کے ذہنی ماحول میں موجود مسائل و محرکات کے ذریعے جڑتے ہیں۔ خطیب فضا میں جن جن افکار و محرکات کو دیکھتا ہے، موقع کی مناسبت سے اُن سے تعرض کرتا ہے اور مخاطب جماعت یا معاشرے کو خوب شعور ہوتا ہے کہ مختلف اجزائے کلام کا ربط کیا ہے۔

مزید وضاحت کے لیے یہ حقیقت بھی سامنے رکھنی چاہیے کہ قرآن کسی فلسفی یا درویش یا ریفارمر کے دیے ہوئے خطبات کا مجموعہ نہیں ہے۔ وہ تو ایک جہانی انقلابی تحریک تھی جو خدا پرستانہ نظامِ حیات کو تمام شعبوں سمیت دنیا میں برپا کرنے کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت و سربراہی میں اٹھی تھی۔ حضورؐ کی زبانِ مبارک سے خداوند تعالیٰ کے مرتب کردہ خطبات حسبِ موقع صادر ہوتے رہے۔ جوں جوں اسلامی تحریکِ انقلاب آگے بڑھی، نئے نئے مراحل کے ساتھ نئے نئے مباحث چھڑتے گئے۔ مکے کا مرحلہ صبر و ابتلا، ہجرت کی وجہ سے واقع ہونے والا بھاری تغیر، پھر اسلامی جماعت کا یہود کی مخالفتوں اور منافقین کی شرارتوں سے دوچار ہوتا، پھر جنگ و قتال کا مرحلہ اور فتحِ خیبر و مکہ۔ اس سلسلہ واقعات کے ساتھ مدینے میں دستوری معاہدے کی تدوین، مہاجرین و انصار میں مواخات، مسلمانوں کی عسکری تربیت اور آس پاس کی آبادیوں کے سرداروں سے معاہدانہ تعلقات کا استوار ہوتے جانا، یہ سارے احوال اصل دعوت و تحریک سے مربوط تھے۔ اسی طرح تدریجاً قوانین کا نفاذ —— مثلاً فرضیتِ زکوٰۃ سنہ ۲ھ، سود خواری کے ترک کے لیے ابتدائی اشارات سنہ ۳ھ، یتامیٰ کے بارے میں احکام اور وراثت کے ضابطے کا اجرا سنہ ۳ھ، قانونِ ازدواج اور حقوق الزوجین کا ایک حصہ سنہ ۳ھ، امتناعِ شراب کے لیے ابتدائی تنبیہات سنہ ۳، ۴ھ، پردے کا قانون سنہ ۴ھ، زنا، قذف اور لعان کے فوجداری قوانین، نیز پردے کے تفصیلی احکام سنہ ۵ھ، محاربہ اور سرقہ کی سزا کا اعلان سنہ ۵، ۶ھ، نکاح و طلاق کے مزید تفصیلی احکام سنہ ۷ھ، حرمتِ شراب کا قطعی قانون سنہ ۸ھ اور سود کا کلی انسداد سنہ ۹ھ۔ یہ چند مثالیں مدعا کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔ قرآن کے خطبات میں ان سارے قوانین پر بھی، اور دوسرے بہت سے احکام پر بھی گفتگو کی گئی ہے، ان کے ساتھ عقاید پر بھی کلام آتا ہے، ان کے ساتھ پیشِ نظر معاشرے کے مختلف عناصر اور ان کے ذہنی کوائف پر بھی گفتگو ہوتی ہے۔

یعنی قرآن اور اس کے نظم کو سمجھنے کے لیے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سرگرمیٔ حیات اور آپ کے ہاتھوں برپا ہونے والی تحریکِ انقلاب کے مد و جزر کو جاننا ضروری ہے۔ ۲۳ برس تک اِدھر یہ کلام نازل ہوتا رہا اور اُدھر اس کی رہنمائی کے مطابق وہ کام ہوتا رہا۔ لہٰذا قرآن فہمی کے لیے قرآن کی ہدایات کے مطابق ہونے والے کام کو، اور اس کارِ عظیم کے کارپرداز (صلی اللہ علیہ وسلم) کی روئیداد زندگی کو جاننا لازم آتا ہے۔ قرآن اور رسولؐ باہم دگر ہم آہنگ ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی شرح ہیں۔

یہاں ایک ضمنی اشارہ میں اس امر کی طرف بھی کرنا چاہتا ہوں کہ ساری تاریخ میں چند افراد نے اس نقطۂ نظر کو اختیار کیا ہے کہ قرآن کی تفسیر قرآن ہی سے کی جائے اور قرآن کو سمجھنے کے لیے باہر سے کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ یہ فلسفی کتنی ہی صحیح ثابت کر دی جائے۔ کوئی مسلمان قرآن کو رسولؐ سے اور رسولؐ کو قرآن سے الگ رکھ کر دین کے بارے میں کچھ سوچ بھی نہیں سکتا۔ قرآن اور رسولؐ کو ساتھ ساتھ رکھ کر اگر کوئی گروہ اعلیٰ درجے کے حکما اور دانش وروں کے لیے نظمِ قرآن کی کوئی پیچیدہ ترین فلاسفی بھی وضع کرے تو فی نفسہٖ اس میں کوئی ہرج نہیں۔ اہلِ تدبر کسی پہلو سے جہاں تک جا سکتے ہوں جائیں۔ مگر سوال متوسط درجے کے نوجوانوں کا ہے جو دین کو سمجھنا چاہتے ہیں، ان کو تو نظمِ قرآن کا ایسا تصور دلانا چاہیے جیسے وہ آسانی سے اخذ کر سکیں۔ ورنہ اگر وہ کسی پُراسرار بھاری بھرکم تصورِ نظم کی مرعوبیت کے بوجھ تلے ہی دبے پڑے رہیں تو وہ بیچارے قرآن کو سمجھنے یا اُس پر عمل کرنے کے لیے موقع ہی کہاں پائیں گے۔ قرآن اپنے مطالعہ کرنے والوں کو مدبّر بنانا چاہتا ہے، مگر ایسے مدبّر جو عملاً تحریکِ حق کے سپاہی بھی بن سکیں، نہ یہ کہ نکات و لطائف کی ایسی گہرائیوں میں غوطہ زن رہیں کہ بس معمّہ ہی بن سکیں۔

اگر قرآن کو سمجھنے کے لیے لغت، صرف و نحو، علمِ فصاحت و بلاغت اور عرب کی جاہلی شاعری کا حوالہ دیے بغیر ہم ایک قدم نہیں چل سکتے، تو پھر آخر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی شخصیت سے بے نیازی کیوں؟ جو قرآن کو پیش کرنے والے، اُس کی اساسی دعوت کو پھیلانے اور اس راہ میں مشقتیں اٹھانے والے اور قرآن کے نقشے پر ایک نظامِ جماعت، ایک ہیئتِ معاشرہ، ایک ادارۂ حکومت کو بنانے اور چلانے اور اُن کی پیچیدگیوں کو قرآن ہی کی منشا کے مطابق حل کرنے والے ہیں۔ بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سارا کام —— دعوت، تحریک، تنظیم، ہجرت، جہاد، اقامتِ نظامِ حق —— سب کچھ تا قیامت مسلمانوں کے لیے نمونہ و معیار کی حیثیت رکھتا ہے۔ حق یہ ہے کہ رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت و سنّت نظمِ قرآن کی گرہیں کھولنے کا بہترین ذریعہ ہے۔

دین کے بہت سے الفاظ و اصطلاحات ہیں جن کا ایک خاص مفہوم حضورؐ نے اپنے قول و فعل سے متعین کیا ہے۔ کلام اللہ کے بعض اوامر و نواہی کی صحیح عملی صورت حضورؐ کی سنّت سے واضح ہوتی ہے، بعض مقامات پر آیات کا ربط اور کلام کا نظم بھی اُس سلسلۂ واقعات کی روشنی میں عیاں ہوتا ہے جس کا سررشتہ حضورؐ نے تھام رکھا تھا۔

مجھے اُمید ہے کہ کوئی بھی طالب علم اگر قرآن کا مطالعہ طلبِ ہدایت کے لیے کرے گا تو خواہ وہ غیر مسلم ہو یا مسلم، وہ اگر تین باتیں ذہن نشین رکھے تو وہ قرآن کے کلام کا صحیح نظم پالے گا اور اس سے صحیح استفادہ بھی کر سکے گا۔

ایک یہ کہ قرآن کسی محدود مذہب کی کتاب نہیں ہے، بلکہ ایک دین و تہذیب کا جامع نقشہ لے کر آئی ہے۔

دوسری یہ کہ وہ فلسفے یا کہانیوں کے سے نظم پر مشتمل نہیں ہے، بلکہ اس کے اجزائے کلام کا ربط و نظم خطابتی قسم کا ہے۔

تیسری یہ کہ قرآن کچھ غیر متحرک (STATIC) حقائق کے بیان تک محدود نہیں ہے بلکہ ایک نشوونما پاتی ہوئی اور مخالف قوتوں سے ٹکراتی ہوئی انقلابی تحریک کا آئینہ دار ہے۔

اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو مطالعۂ قرآن کا شوق دے، اس کے نظم کا شعور عطا کرے اور اس کے حقائق و معارف کو سمجھنے اور ان پر عمل پیرا ہونے کی توفیق دے۔ آمین۔

(بشکریہ ریڈیو پاکستان لاہور)

ایک فراموش شدہ سنّت

مولینا سید محمود حسن - استاذ حدیث - جامع العلوم - ملتان

اِس مختصر سے مضمون میں صاحب نگارش نے بہت سی احادیث نبوی (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسی جمع کی ہیں جو دلالت کرتی ہیں کہ آجکل ننگے سر رہنے کا جو رواج عام چل پڑا ہے، یہ سنّتِ نبوی اور اسلامی تہذیب کے خلاف ہے۔

۱ — إِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ دَخَلَ يَوْمَ الْفَتْحِ مَكَّةَ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ۔

(نسائی عن جابر کتاب المناسک، مسلم کتاب الحج)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم فتح کے دن (۸ھ) مکہ میں جب تشریف لائے تو آپ کے سر مبارک پر سیاہ پگڑی تھی۔

۲ — عَنْ عَمْرِو بْنِ حُرَيْثٍ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلَى الْمِنْبَرِ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ سَوْدَاءُ قَدْ أَرْخَى طَرَفَيْهَا بَيْنَ كَتِفَيْهِ۔

(مسلم کتاب الحج، ابوداؤد کتاب اللباس باب فی العمائم)

عمرو بن حُریث رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ وہ کہتے ہیں میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو منبر پہ تقریر کرتے ہوئے دیکھا۔ آپ کے سر پہ سیاہ پگڑی تھی جس کا شملہ آپ کے دونوں کندھوں کے درمیان لٹک رہا تھا۔

۳ — كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ إِذَا اعْتَمَّ سَدَلَ عِمَامَتَهُ بَيْنَ كَتِفَيْهِ۔

(ترمذی عن ابن عمر ابواب اللباس)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب پگڑی باندھتے تو اُس کے شملے کو اپنے کندھوں کے درمیان لٹکاتے۔

۴ ــــ عَنْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ عَوْفٍ يَقُولُ عَمَّمَنِي رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَسَدَلَهَا مِنْ بَيْنِ يَدَيَّ وَمِنْ خَلْفِي (ابوداؤد، کتاب اللباس)

عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے سر پر پگڑی باندھی تو اُسے (یعنی اُس کے ایک شملے کو) میرے آگے اور (دوسرے شملے کو) میرے پیچھے لٹکا دیا۔

امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں:۔

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم صرف پگڑی باندھتے تھے۔ آپؐ نے پگڑی کے نیچے ٹوپی بھی پہنی ہے، اور اور بعض اوقات آپؐ نے صرف ٹوپی پہنی ہے" (زاد المعاد، فصل فی الملابس)

عموماً آپؐ کی پگڑی کا شملہ آپ کے دونوں کندھوں کے درمیان رہتا۔ اور کبھی دائیں جانب ہوتا۔ حضورؐ کبھی شملہ کے بغیر بھی پگڑی باندھتے۔ پگڑی کا شملہ رکھنے میں فضیلت ہے لیکن شملہ کے بغیر پگڑی باندھنا بھی جائز ہے۔

۵ ــــ عَنِ الْمُغِيرَةِ بْنِ شُعْبَةَ قَالَ تَوَضَّأَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَمَسَحَ عَلَى الْخُفَّيْنِ وَالْعِمَامَةِ۔ (ترمذی ابواب الطہارۃ)

حضرت مغیرہ بن شعبہؓ سے روایت ہے وہ کہتے ہیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو کیا۔ پگڑی اور موزوں پر مسح کیا۔

۶ ــــ عَنْ عَمْرِو بْنِ أُمَيَّةَ الضَّمْرِيِّ قَالَ رَأَيْتُ النَّبِيَّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَمْسَحُ عَلَى عِمَامَتِهِ وَخُفَّيْهِ۔ (بخاری کتاب الطہارۃ۔ باب المسح علی الخفین)

عمرو بن امیہ سے روایت ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو (وضو میں) اپنی پگڑی اور موزوں پر مسح کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

۷ ــــ عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ رَأَيْتُ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَتَوَضَّأُ وَعَلَيْهِ عِمَامَةٌ قِطْرِيَّةٌ فَأَدْخَلَ يَدَهُ مِنْ تَحْتِ الْعِمَامَةِ فَمَسَحَ مُقَدَّمَ رَأْسِهِ وَلَمْ يَنْقُضِ الْعِمَامَةَ (ابوداؤد کتاب الطہارۃ باب المسح علی العمامۃ)

حضرت انسؓ بن مالکؓ کہتے ہیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو کرتے ہوئے دیکھا ہے۔

آپ (کے سرمبارک) پر "قطر" کا بنا ہوا عمامہ تھا۔ آپ نے اپنے ہاتھ کو پگڑی کے نیچے داخل کیا اور اپنے سر کے اگلے حصے کا مسح کیا اور سر سے پگڑی نہیں اتاری۔

۸ — عَنْ عُرْوَةَ بْنِ الزُّبَيْرِ كَانَ يَنْزِعُ الْعِمَامَةَ وَيَمْسَحُ رَأْسَهُ بِالْمَاءِ

(موطا مالک کتاب الطہارۃ)

عروہ بن زبیر (جب وضو کرتے تو) پگڑی کو سر سے علیحدہ کرکے پانی سے اپنے سر کا مسح کرتے۔

۹ — عَنْ ثَوْبَانَ قَالَ بَعَثَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ سَرِيَّةً فَأَصَابَهُمُ الْبَرْدُ فَلَمَّا قَدِمُوْا عَلَى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ۔ أَمَرَهُمْ أَنْ يَمْسَحُوْا عَلَى الْعَصَائِبِ وَالتَّسَاخِيْنِ۔ (ابوداؤد کتاب الطہارہ باب المسح علی العمائم)

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، وہ کہتے ہیں کہ (کسی مہم پر) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوجی دستہ بھیجا تو ان پر سردی کا حملہ ہوا جب وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے ان کو پگڑیوں اور موزوں پر مسح کرنے کی اجازت دے دی۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہ "ننگے سر" نہیں رہتے تھے۔ اور وضو کے دوران انہوں نے سر پر باندھے ہوئے عماموں پر مسح کیا۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب وہ وضو کے دوران بھی ننگے سر نہ ہوتے تھے تو کیا ان سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ برہنہ سر ہوکر نماز پڑھتے ہوں گے؟

حقیقت یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ نہ صرف یہ کہ عام حالات میں برہنہ سر نہ رہتے تھے بلکہ وہ سر ڈھانپ کر ہی نماز پڑھتے تھے۔ اِلّا یہ کہ سر پر پہننے کے لیے ان کے پاس کوئی کپڑا نہ ہوتا۔

بخاری کی ایک روایت ہے:

قَالَ الْحَسَنُ كَانَ الْقَوْمُ يَسْجُدُوْنَ عَلَى الْعِمَامَةِ وَالْقَلَنْسُوَةِ وَيَدَاهُ فِىْ كُمِّهٖ۔

(بخاری کتاب الصلوٰۃ باب السجود علی الثوب تعلیقاً)

حسن بصریؒ نے فرمایا (نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے) صحابہ (سخت گرمی میں بھی) پگڑی اور ٹوپی پر سجدہ کیا کرتے تھے۔ اور ان میں سے ہر شخص کے ہاتھ اپنی آستین میں ہوتے۔

علامہ ابن حجرؒ نے "عبدالرزاق" اور "ابن ابی شیبہ" سے اور علامہ ابن الہمامؒ نے بیہقی سے اس روایت

کو ان الفاظ میں نقل کیا ہے:-

عَنِ الْحَسَنِ اِنَّ اَصْحَابَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانُوْا يَسْجُدُوْنَ وَ اَيْدِيْهِمْ فِيْ ثِيَابِهِمْ وَيَسْجُدُ الرَّجُلُ مِنْهُمْ عَلٰى قَلَنْسُوَتِهٖ وَعِمَامَتِهٖ -

(فتح الباری کتاب الصلوٰۃ باب السجود جلد ۱ ص ۴۱۴ ـ فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۱۳)

حسن بصریؒ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہؓ اس حال میں سجدہ کرتے تھے کہ ان کے ہاتھ ان کے کپڑوں میں ہوتے ان میں سے ہر شخص اپنی ٹوپی پر سجدہ کرتا - اور کوئی اپنی پگڑی پر سجدہ کرتا -

علامہ ابن الہمامؒ فرماتے ہیں:

عبداللہ بن ابی اوفیٰؓ، عبداللہ بن عباسؓ اور عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ:-

اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ كَانَ يَسْجُدُ عَلٰى كَوْرِ عِمَامَتِهٖ -

(فتح القدیر جلد ۱ ص ۲۱۳ - بحوالہ طبرانی وابو نعیم فی الحلیۃ وابوالقاسم فی فوائدہ)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پگڑی کے پیچ پر سجدہ کیا کرتے تھے -

مغربی تہذیب نے نہ صرف یہ کہ مردوں کے سر سے پگڑی اور ٹوپی چھین لی ہے بلکہ عورتوں کو بھی دوپٹے سے آزاد کر دیا ہے - افسوس ہے کہ گندی تہذیب کے اس سیلاب میں پڑھے لکھے اور شریف مرد اور خواتین بھی تنکوں کی طرح بہتے چلے جا رہے ہیں ؎

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مشہور فقیہہ اور محدث شیخ عبدالحق دہلوی رحمۃ اللہ نے لکھا ہے کہ:-

پوشیدن عمامہ سنت است (اشعۃ اللمعات) سر پر پگڑی پہننا سنت ہے -

حنفی مسلک کے محقق عالم ملا علی قاری رحمہ اللہ نے لکھا ہے کہ:-

بعض علماء کے نزدیک پگڑی اور ٹوپی پہننا مسنون ہے (مرقاۃ)

اس مسئلہ میں ہماری تحقیق یہ ہے کہ سر پر پگڑی باندھنا اور ٹوپی پہننا بلاشبہ مسنون ہے - لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جس طرز کی پگڑی یا ٹوپی حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ملک کے مخصوص تمدنی اور موسمی حالات کی بنا پر پہنا کرتے تھے - ہر دور کے مسلمانوں کو بالکل بعینہ اس طرز کی پگڑی یا ٹوپی سر پر پہننی چاہیے، ہاں، جو شخص سر پر عمامہ باندھنے اور اس کا شملہ پیچھے کی طرف رکھنے کو مسنون سمجھتا ہو، اسے لازماً اپنے اس

فہم پر عمل کرنا چاہیے لیکن وہ نہ تو اپنے اس فہم حدیث کو دوسروں پر مسلط کرنے کی کوشش کرے اور نہ وہ اس شخص کو "تارک سنت" قرار دے جو اس طرح عمامہ نہ باندھتا ہو۔

اس سلسلے میں سب روایات کے مطالعہ سے شریعت کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو اپنی استطاعت اور معاشرتی حالات کے مطابق اپنے سر پر پگڑی یا ٹوپی اس طرح کی کوئی اور چیز ضرور پہننی چاہیے۔ اسے ننگے سر نہیں رہنا چاہیے۔ اِلّا یہ کہ کوئی مجبوری ہو، مثلاً اُسے سر پر پہننے کے لیے کوئی چیز میسر نہ ہو، یا اس کے سر پر زخم اور تکلیف ہو یا وہ حالتِ احرام میں ہو۔ افسوس ہے کہ بعض دیندار قسم کے لوگ نہ صرف یہ کہ برہنہ سر رہنے کو معیوب نہیں سمجھتے بلکہ وہ ننگے سر نماز پڑھنے پر بھی اصرار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ "سر کو ڈھانپنا" نماز کی شرائط میں سے نہیں ہے۔

ابن جوزی کہتے ہیں:

وَجَدْتُ بِخَطِّ النَّوَوِيِّ إِنَّ عِمَامَتَهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ خَارِجَ الصَّلٰوةِ تَكُوْنُ ثَلٰثَةَ أَذْرُعٍ وَلِلصَّلٰوةِ سَبْعَةَ أَذْرُعٍ ـــ (مصباح السنن للشیخ محمد یوسف البنوری الجزء الاول ص ۲۵۸)

میں نے امام نوویؒ کے قلم سے یہ بات لکھی ہوئی دیکھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں سات ہاتھ لمبی پگڑی باندھتے تھے اور نماز سے باہر آپ جو پگڑی باندھتے تھے، وہ صرف تین ہاتھ کی ہوتی تھی۔

یہ بات تو تحقیق طلب ہے کہ حضورؐ کا عمامہ کتنا لمبا تھا؟ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ حضورؐ صلی اللہ علیہ وسلم برہنہ سر ہو کر نماز نہیں پڑھتے تھے۔ فقہ کی رو سے تو کرتہ پہننا بھی نماز کی شرائط میں سے نہیں ہے۔ بہتر یہ ہے کہ اب کرتہ پہننا بھی ترک کر دیا جائے۔ فقہی نقطۂ نظر یہ ہے کہ آدمی اگر صرف اپنا ستر ـــــ ناف سے گھٹنے تک ـــــ ڈھانپ لے تو نماز پڑھ سکتا ہے۔

رہا وہ شخص جس کے پاس پہننے کے لیے سرے سے کوئی کپڑا نہ ہو وہ بیٹھ کر اشارے سے رکوع وسجود کر کے نماز ادا کر سکتا ہے۔ لیکن اس سے یہ کہاں لازم آتا ہے کہ آدمی استطاعت کے باوجود کرتہ کے بغیر نماز ادا کرتا رہے یا ننگے سر ہو کر نہ صرف یہ کہ نماز ادا کرنے کو اپنا معمول بنا لے بلکہ اس پر اصرار بھی کرتا رہے۔ معذوری کی صورت میں اگر کسی شخص کو پہننے کے لیے صرف ایک کپڑا میسر ہو تو وہ اُسے پہن کر نماز پڑھ سکتا ہے بشرطیکہ وہ اپنے ستر کو ڈھانپ لے اور اپنے کندھوں پر بھی اُسے ڈال لے

امام ابوحنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے نزدیک اگر آدمی اپنے ستر کو ڈھانپ کر نماز ادا کرے اور اس کے کندھے برہنہ ہوں تو اس کی نماز مکروہ ہونے کے باوجود صحیح ہو جائے گی۔ لیکن امام احمد بن حنبلؒ فرماتے ہیں جس شخص کے کندھے برہنہ ہوں اس کی نماز صحیح نہیں ہے۔

البتہ جو شخص مجبوری یا عدم استطاعت کی بنا پر برہنہ سر ہو کر نماز ادا کرتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اس کی نماز جائز ہے بلکہ اجر و ثواب میں بھی اس نماز کے برابر ہے جو سر ڈھانپ کر ادا کی جاتی ہے۔ لیکن کسی مجبوری یا عدم استطاعت کے باوجود برہنہ سر نماز پڑھنے میں بے ادبی اور بے پروائی کا پہلو ہے۔

نماز ایک اہم عبادت ہے جس میں بندے کو اپنے رب کی بارگاہ میں ادب کے ساتھ اپنی بے بسی اور عاجزی کا بھرپور اظہار کرنا چاہیے۔ اس میں بدن اور لباس کی طہارت کے ساتھ شائستگی اور وقار کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔

۱۰۔ سُئِلَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ؟ قَالَ لَا يَلْبَسُ الْمُحْرِمُ الْقَمِيْصَ وَلَا الْعِمَامَةَ وَالْبُرْنُسَ وَلَا السَّرَاوِيْلَ وَلَا ثَوْبًا مَسَّهُ وَرْسٌ وَلَا زَعْفَرَانٌ وَلَا الْخُفَّيْنِ إِلَّا أَنْ يَجِدَ نَعْلَيْنِ فَلْيَقْطَعْهُمَا أَسْفَلَ مِنَ الْكَعْبَيْنِ۔ (مسلم عن ابن عمر کتاب الحج۔ مطبوعہ کراچی جلد ۱ ص ۳۷۳)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ احرام باندھنے والا کیا پہنے؟

آپؐ نے فرمایا: آدمی احرام کی حالت میں ۱۔ قمیص، ۲۔ پگڑی، ۳۔ لمبی ٹوپی، ۴۔ شلوار، ۵۔ ورس اور زعفران سے رنگا ہوا کپڑا اور ۶۔ پاؤں میں موزے نہ پہنے ــــ اِلّا یہ کہ اس کے پاس جوتے نہ ہوں۔ تب وہ اوپر کا حصہ ٹخنوں کے نیچے تک کاٹ کر پہن لے۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ آدمی کو ہمیشہ سر پر پگڑی یا اس کی جگہ کوئی اور چیز پہننی چاہیے۔ اِلّا یہ کہ وہ حج یا عمرہ کا احرام باندھے۔ مرد احرام کی حالت میں اپنے سر کو کسی چیز سے نہ ڈھانپے۔ وہ نہ تو پگڑی باندھے اور نہ ٹوپی پہنے، بلکہ وہ ان سلا کپڑا بھی سر پر نہیں رکھ سکتا۔ حضورؐ کے عہد میں لوگ ننگے سر نہیں رہتے تھے، وہ سر پر عمامہ باندھتے یا لمبی ٹوپی یا اس طرح کی کوئی اور چیز پہنتے تھے۔ اسی بنا پر حضورؐ نے احرام باندھنے والے کو سر پر پگڑی یا لمبی ٹوپی پہننے سے منع فرمایا۔

مطبوعات

فقہ الزکوٰۃ (حصہ اوّل) از جناب ڈاکٹر یوسف القرضاوی - اردو ترجمہ از ساجد الرحمٰن صدیقی۔
ناشر: البدر پبلی کیشنز — ۲۳ راحت مارکیٹ - اُردو بازار لاہور ۲ - صفحات قریباً سواتین سو۔
قیمت: ۲۱/- روپے

عربی زبان میں ڈاکٹر یوسف قرضاوی دینی موضوعات پر ایک صاحبِ اعتبار شخصیت ہیں - اور سادہ زبان میں دلنشین طرزِ انشا کے ماہر - ان کی مشہور کتاب فقہ الزکوٰۃ (دو ضخیم جلدیں) بڑی قبولیت رکھتی ہے - یہ ایسی پہلی کامیاب کوشش ہے کہ زکوٰۃ کی حکمت کے ساتھ اس کا شرعی قانون اور قانون کے تحت تفصیلی فقہی ضابطے یکجا پیش کیے گئے ہیں - اس کتاب کا ترجمہ ادارۂ معارفِ اسلامی کراچی کے اہتمام سے ساجد الرحمٰن صدیقی کر رہے ہیں - ترجمے کا حصہ اوّل سامنے ہے - بقیہ کام تین مزید حصوں میں مکمل ہوگا - ترجمے کی باریکیوں کو جانچنا تو یہاں ممکن نہیں، فی الجملہ اچھا خاصا ہے - اگرچہ سرورق موٹے آرٹ پیپر کا ہے - یعنی پیپر بیک طرز پر، مگر پھر بھی ۲۱/- روپے غیر نامناسب قیمت ہے -

---

نورالدین محمود زنگی تالیف جناب طالب ہاشمی - ناشر: قومی کتب خانہ لاہور - صفحات: ۳۳۲
پیپر بیک جلد مع رنگین گرد پوش - قیمت: صرف ۲۴/- روپے -

جناب طالب ہاشمی آج ایک صاحبِ مقام مصنّف ہیں - انہوں نے اپنے ذمہ یہ فریضہ لیا ہے کہ وہ شجرۂ ملت کی کونپلوں کا تعلق جڑوں سے قائم رکھیں گے - صحابہ اور صحابیات اور سلاطینِ عادل کے سوانحی حالات کے ساتھ وہ مؤرخانہ ذمہ داریاں بھی ادا کرتے ہیں - مثلاً پیشِ نظر کتاب صرف ایک شخصیت کی سوانح عمری نہیں ہے، بلکہ ایک دور کی تاریخ بھی ہے - عباسی دور کا عروج و شکوہ اپنی جگہ، لیکن اس دور میں ہماری تاریخ کے دریا میں پے درپے ایسے گرداب پڑے کہ کشتی کا بچ کر نکلنا مشکل ہوگیا - عباسیوں

نے عجمیوں کو عربوں کے خلاف استعمال کیا۔ پھر آٹھویں خلیفہ المعتصم باللہ نے ترکوں کو بطور ایک تیسرے عنصر کے ابھارا۔ اور ترک آہستہ آہستہ درباری سیاست پر حاوی ہوگئے۔ ۳۳۴ھ میں آلِ بویہ (شاہانِ دیلم) نے ترکوں کی جگہ لی۔ پھر طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا۔ اُدھر ہسپانیہ میں پہلے مرابطین اور پھر موحدین اُبھرے اور آخر انتشار پھیل گیا۔ شمالی افریقہ میں فاطمی خلافت کا آغاز ہوا۔ اور ۲۹۷ھ میں بغداد پر سیاہ فاطمی علم لہرانے لگا۔ ۳۱۷ھ میں قرامطہ نے مکہ پر حملہ کرکے حاجیوں کو قتل کیا اور شعائرِ حرم کی شدید توہین کی۔ ۴۴۷ھ میں سلطان طغرل بیگ کے زیرِ علم سلجوقیوں کا بغداد پر تسلط ہوا۔ اُدھر حسن بن صباح باطنیوں نے مسلمانوں کی دینی و دنیوی شخصیتوں کے قتل کی مہم شروع کی۔ ۴۹۰ھ میں صلیبی جنگوں کا دور شروع ہوگیا۔

یہ تھا ماحول جس کی تاریکیوں سے پہلے زنگی خاندان کا عماد الدین نمودار ہوا اور پھر نورالدین۔ نورالدین نے خوفناک طوفانی دور میں سفینۂ ملت کی پتوار سنبھالی اور موج در موج فتنوں کا مقابلہ کیا اور صلیبیوں کو منہ توڑ جواب دیا۔

مگر نورالدین صرف ایک سلطان اور سپہ گر ہی نہیں تھا، صاحبِ ایمان و کردار مسلم بھی تھا۔ اس کی شخصیت اور کارناموں کو سمجھنے کے لیے آج ہمارے پاس طالب ہاشمی کی بہترین کتاب موجود ہے جس کی قیمت بھی حیرت ناک حد تک کم ہے۔

سعدؓ بن ابی وقاص | تالیف: طالب ہاشمی۔ ناشر: قومی کتب خانہ لاہور۔ صفحات: ۲۴۴۔ پیپر بیک طرز کی جلد مع رنگین گرد پوش۔ قیمت: ۱۶/- روپے

سعدؓ بن ابی وقاص صفِ اوّل کے صحابی ہیں۔ ایک روایت کے بموجب جس دن حضرت ابوبکر صدیق ایمان لائے، اُسی دن چند گھنٹوں کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاص بھی مسلمان ہوگئے۔ سابقون الاولون میں اُن کا نمبر تیسرا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہوکر ابتدائی دورِ دعوت میں حصہ لیا۔ مکہ کے ابتلا سے گذرے۔ ہجرت کی اور بدر و اُحد کے علاوہ دیگر غزوات و سرایا میں شریک ہوئے۔ چاروں خلفائے راشدین کے دور میں اُن کے زیرِ حکم جہاد کیا۔ بڑی بڑی فتوحات کا سہرا اُن کی قیادت کے سر بندھتا ہے۔ حضرت عمرؓ کے حکم سے عراقِ عرب کے علاقے میں مدائن کو مرکز بناکر اس علاقے کا نظم و نسق سنبھالا اور خوبی سے کام کیا۔ کوفہ شہر کی تعمیر کرائی۔ حضرت سعدؓ ہی نے کوفہ کے وسط میں پہلی رفیع الشان کشادہ مسجد تعمیر کرائی جس میں چالیس ہزار نمازی بیک وقت

سربسجود ہو سکتے تھے۔ حضرت عمر فاروقؓ نے قریب بہ نزع جن چھ اصحاب کی کمیٹی آئندہ خلیفہ کے انتخاب کے لیے بنائی تھی۔ آپ اس میں ایک سعد بن ابی وقاص تھے۔ حضرت علی مرتضٰی اور امیر معاویہ کے درمیان نزاع چلی تو وادی عقیق میں گوشہ نشین ہو گئے۔ سنہ ۵۵ھ میں وفات پائی۔

اس نور افروز شخصیت کی کتاب سوانح کا تفصیلی مطالعہ متذکرہ کتاب میں کرتے ہوئے قرون اولیٰ کی تاریخ کے کئی ابواب نگاہوں کے سامنے سے گذر جاتے ہیں۔

مجھے خوشی ہوئی کہ اس کتاب کی قیمت بھی عام شرح سے بہت کم ہے۔

حضور اکرمؐ اور ہجرت تالیف: سید اسعد گیلانی۔ ناشر: ادارہ ترجمان القرآن، لاہور۔ صفحات: ۲۱۱

قیمت: -/۲۰ روپے

سید اسعد گیلانی کا نام بھی نمایاں ہے اور ان کا کام بھی معروف۔ لکھنے میں وہ ایک طرف ادبی حسن و لطافت رکھتے ہیں، دوسری طرف ان کی تحریروں کی فضا انقلابی ہوتی ہے۔ یہی ادبی لطافت اور جذبۂ انقلاب پیش نظر کتاب کو خاص توجہ کا مستحق بنا دیتا ہے۔

اسلامی اصطلاح میں ہجرت صرف نقل مکانی کا نام ہی نہیں، بلکہ یہ نوت کی طرف پیش قدمی اور انقلابی طرز پر سیرت سازی کا ایک پروگرام ہے۔ اسعد صاحب کی تحریر واضح کرتی ہے کہ حضورؐ کی ہجرت مظلومانہ صبر کے مبے دور سے نکل کر جہاد کی راہ پر گامزن ہونے کا مفہوم رکھتی ہے۔

رہی واقعۂ ہجرت کی تاریخ، سو ہجرت اور ہجرت سے پہلے اور ہجرت کے بعد کے احوال کو تفصیل سے اس کتاب میں بیان کیا گیا ہے۔ سلسلۂ بیان میں سیرت پاک اور واقعات و حالات کی تفصیل بڑی خوبی سے سامنے آتی ہیں۔ خصوصیت سے "حرفِ اول" میں گیلانی صاحب نے پورے جوشِ ایمانی اور زورِ قلم سے تاریخ میں اسلام اور مخالفِ اسلام قوتوں کی کشمکش پر کلام کیا ہے۔ ان ابتدائی صفحات ہی میں اسلامی انقلاب کا ایک موثر درس موجود ہے۔

واقعۂ ہجرت پر شاید اس انداز کی کوئی بحث یا کتاب پہلے موجود نہیں

فاضل بریلوی اور اُمورِ بدعت از جناب سید فاروق القادری - ایم اے - ناشر: رضا پبلی کیشنز، مین بازار، داتا صاحب، لاہور - صفحات: ۳۱۲ - مجلد - قیمت: ۲۴/- روپیے

اس کتاب کے تفصیلی مباحث پر گفتگو کرنے کی ضرورت محسوس کرنے کے باوجود مجھے مجبوراً اجمالی تعارف کی راہ اختیار کرنی ہے۔

پہلی بات تو میں یہ کہتا ہوں کہ فرقوں اور گروہوں سے قطع نظر، برصغیر کے علماء کی صف میں مولانا احمد رضا خاں بریلوی کا ایک مقام ہے۔

دوسری بات اس کتاب کو پڑھ کر میں نے یہ محسوس کی کہ قانونِ شریعت اور فقہی احکام کے دائرے میں ہمارے مختلف مدارسِ فکر کے اہلِ سنت علماء میں کوئی بڑا بُعد نہیں ہے۔ خصوصاً مولانا بریلوی کے متعلق جو رواج یافتہ تصور اصولی عقائد اور احکام و مسائل کے دائرے میں برقرار نہیں رہتا کہ موصوف نے کوئی جادۂ انحراف اختیار کیا۔ بہت سی چیزیں متوسلین کی پیدا کردہ ہیں اور مناظرہ و مجادلہ کی فضا میں اُن میں مبالغہ پیدا ہوتا گیا۔ رہی سہی کسر کوتاہ علم واعظوں اور امامانِ مساجد نے پوری کر دی۔

تیسری بات یہ محسوس ہوئی کہ سید فاروق القادری صاحب اچھے انشاء پرداز ہیں اور اُن کی تحریر زوردار ہے، مگر انہوں نے جس غیر جانبدارانہ مقام سے بات کرنے کا عزم کیا تھا، وہ مقام چھوٹ گیا۔ ایک طرف وہ وکیل صفائی کا پارٹ ادا کرتے ہیں اور دوسری طرف حلقۂ اہلِ اختلاف کے خلاف پورے زور سے اپنا مقدمہ اُٹھاتے ہیں۔ یہ حق بھی ہمیں تسلیم، مگر انہوں نے یہ مقام کسی اور کے لیے خالی چھوڑ دیا۔ جو غیر جانبدارانہ انداز سے مختلف گروہوں کے کلمۂ سواء کو پیش کر کے اُن سے اتحاد کی اپیل کرے۔ کہنے کی اصل بات یہ ہے کہ کوئی اہلِ حدیث ہو یا دیوبندی، وہابی ہو یا بریلوی، توحید اور ختمِ رسالت کے عقیدوں کو محکم رکھ کر الحاد و دہریت اور مغربی تہذیب کے سیلاب کے خلاف تمام مسلمانوں کو متحد کرنے کی سعی کرے اور پھر اقامتِ دین کے جہاد میں اپنا حصہ ادا کرے۔ ہم جن خوفناک قسم کی استعماری، لادینی اور سیکولر طاقتوں کی زد میں ہیں۔ وہ نہ کسی وہابی کو بخشتی ہیں، نہ بریلوی کو۔ اُن کے سامنے یہ سوال نہیں کہ کون بلند آواز سے درود شریف پڑھتا ہے، کون آمین بالجہر کہتا ہے اور کون قُل کرتا ہے۔ وقت کے معرکے کو سمجھیے اور اپنے اختلافات کے باوجود ایک محاذ پر صف آرا ہو جائیے۔

چوتھی بات یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ کسی فریق کی طرف سے دوسرے گروہوں سے یہ مطالبہ کرنا کہ

اپنی کتابوں کی فلاں فلاں عبارت کو بدلو، اِس وجہ سے بے معنی ہے کہ ان عبارات یا ان میں شامل اصطلاحات کے مقصد و مدعا میں اختلاف ہو رہا ہے۔ ایک طرف کے قائل کا وہ منشا ہی نہیں جو دوسری طرف کا ناقد سامنے لا رہا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے آپ مولانا احمد رضا خاں کے متعلق یہ بحث اُٹھاتے ہیں کہ اُن کو غلط سمجھا گیا ہے، بعینہٖ دوسروں کو بھی یہی شکایت ہو سکتی ہے۔

بہر حال یہ کتاب اس لحاظ سے قابلِ مطالعہ ہے کہ ایک نئی طرز کی کوشش ہے اور جدید زبان و ادب میں بات کی گئی ہے۔

اسلامی سیاست تالیف: مولینا گوہر رحمٰن صاحب۔ ناشر: دار العلوم تفہیم القرآن، مردان۔ صفحات: ۴۱۴۔ موٹے آرٹ کارڈ۔ خوبصورت رنگین سرورق۔ قیمت: ۴۵/۰۰ روپے۔

پچھلے کچھ عرصہ میں جمہوریت، نمائندگی، ووٹنگ، شورائیت اور سیاسی جماعتوں سے متعلق جو بحث چھڑی رہی ہے۔ اُس میں طرح طرح کے اندازِ فکر سامنے آئے ہیں۔ اور نہایت درجہ متفرق باتیں کہی گئی ہیں۔ فکری انتشار کی اس فضا میں مولانا گوہر رحمٰن صاحب کی یہ کتاب اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ مولانا نے کتاب و سنّت کے نصوص، مسلم فقہا اور ائمہ سیاست کے حوالوں سے ہر مسئلے پر بحث کی ہے۔ دوسری طرف اُن کی نظر دورِ حاضر کی سیاسی فکر اور اداروں پر بھی ہے۔ نیز وہ تمدنی اور معاشرتی تبدیلیوں کا شعور بھی رکھتے ہیں۔ احوال و ظروف کے بدلنے سے اُصول تو نہیں بدلتے۔ مگر اُن کے عملی انطباقات میں ایک گونہ اجتہادی نقطۂ نظر سے کام لینا پڑتا ہے۔

اس کتاب کی قدر و قیمت ایک تو اس وجہ سے ہے کہ تمام متعلقہ سوالات پر اصل احکام و مآخذ کو جمع کر دیا گیا ہے، دوسرے اس وجہ سے کہ ماضی کے نظائر کو سامنے رکھ کر مقررہ فقہی اسلوب پر اجتہادی زاویۂ نگاہ دیا گیا ہے۔

گہری فکریں — از جناب مقبول طارق۔ ناشر: طارق اکیڈمی سکھر۔ صفحات: ۴۵۵

قیمت مجلد -/۳۰ روپے۔

میرے دل میں ایسے نوجوانوں کے لیے بڑی محبت ہے جن کے دلوں میں تپش ہے، جن کے دماغ سوچتے ہیں اور جو روزمرہ زندگی کی عام ہماہمی میں کھو جانے کے بجائے فکر و کاوش سے حقیقت کا ایسا راستہ تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو کسی اعلیٰ مقصد تک لے جائے۔ "گہری فکریں" کے مؤلف کو بھی میں نے ایسا ہی جوانِ بے تاب پایا۔

اس کتاب کا مواد فلسفیانہ اور پیرایۂ بیان ادبی ہے اور اس کے مؤلف نے زندگی کے متعلق کوئی اہم موضوع نہیں چھوڑا۔ تحریر جدید لٹریچر کے مطالعہ کی آئینہ دار ہے۔ مؤلف کی ساری بحثوں کو پڑھ کر میں نے جو رائے قائم کی ہے۔ وہ یہ ہے کہ تمام ابواب کے شاخساروں پر ایک بڑے سوال کی بیل پھیلی ہوئی ہے۔ لفظوں کو نچوڑیں تو اسی سوال کا رس نچڑنے لگتا ہے۔ میں صرف دو جملے نقل کرتا ہوں۔

"اگر ہمیں خدا نے پیدا نہیں کیا تو پھر ہمارا خالق کون ہے؟ ہم کس طرح پیدا ہوئے اور کس مقصد کے لیے پیدا ہوئے۔" (ص ۱۱۱)

"وقت کی اہم ضرورت یہ ہے کہ ہم مقصدِ حیات تلاش کریں۔ جب تک انسان اپنی منزل متعین نہیں کر لیتا، جب تک زندگی کے حقیقی مقصد کی سائنسی وضاحت نہیں ہو جاتی، ہم یونہی اندھیروں میں بھٹکتے رہیں گے۔"

نوجوان مؤلف کو میں عجیب الجھن میں دیکھ کر اپنے دل میں ہزار درد محسوس کرتا ہوں کہ وہ "لا" کی منزل کو پار کیے بغیر "الا" کا پرچم بلند کر رہا ہے اور سوال کے مرحلے میں ہوتے ہوئے سوال کا وہی جواب ہمارے سامنے رکھ دیتا ہے، جو مغربی فلسفے کی طرف سے پہلے سے موجود ہے۔ جواب کیا ہے: "حیات برائے دوامِ حیات"! (ص ۱۱۲) اور اسی مفہوم کا دوسرا پیرایہ یہ کہ: "زندگی کی سب سے بڑی فرحت زندہ رہنا ہے"! (ص ۱۱۸) نقطہ جہد للبقا اور اس کے لیے منفعت و مسرت کی طلب اور درد و ضرر سے گریز اور دوسری عبارات کی شہادت کے مطابق تصوراتی دورِ ماضی کی اشتمالیت کے زیر اثر اشتراکی نظام کی کشش!

جس مادہ پرستانہ طرز فکر (جس کے تحت علم کو حواس و قیاس کے دائروں تک محدود کر دیا گیا ہے) مثلاً پلوٹو بلازم کے متعلق ساری گفتگو میں، نظریۂ ارتقا کی بھرپور تائید اور فلسفہ افادیت وغیرہ کو اس کتاب میں مقبول طارق صاحب نے اپنے اختیار کردہ فلسفے کی حیثیت سے قبول کیا ہے۔ اس سے پیدا شدہ جدید تہذیب اور مغربی معاشرے، فلسفے اور سائنس کے خلاف جو مایوس کن تاثرات لکھے ہیں، وہ خود اس بات کے گواہ ہیں کہ وہ نظریات درست نہیں ہیں جن پر نئی دنیا تعمیر ہوئی ہے۔

بہر حال "گہری فکریں" کے حساس مؤلف سے ہم یہ امید کرتے ہیں کہ وہ کالج کے پڑھے ہوئے لٹریچر کو سامنے رکھ کر از سر نو مغرب اور فلسفۂ مغرب اور سائنس کی پیدا کردہ پیچیدگیوں کا مطالعہ بھی کریں اور خاص مواقع نکال کر اسلام کو اس شکل میں دیکھنے کی کوشش کریں جو علم اور جہل دونوں قسم کے ستر حجابوں کے پیچھے چلی گئی ہے۔ پھر وہ انھیں اور ہمارے پیش رو طبقوں اور ان کے زیر اثر تعلیم یافتہ عناصر کو عقل کی جہالتوں کے چکر سے نکالیں۔ خاص طور پر فلسفے کے دائرے میں فضاؤں کو ایک ایسے عظیم نوجوان کا انتظار ہے۔

آخر مقبول طارق ہی وہ عظیم نوجوان کیوں نہ ہوں۔

فیوض الحرمین سیّد محمد عبدالعزیز شرقی۔ ناشر: المفضل، سرور روڈ، ملتان شہر، پاکستان
صفحات: ۹۶ قیمت: دس روپے

شرقی صاحب مرد مومن ہیں اور اسی لیے شیدائے رسولؐ۔ پہلے اُن کی محبت بار بار انہیں مدینے لے جاتی رہی۔ اب تو ڈیرے ہی کوئے جاناں میں ڈال رکھے ہیں۔ اُن کی شاداب شخصیت سے، اُن کے جذب دروں کی وجہ سے نعتیہ شاعری کا سرچشمہ پھوٹا۔ نعتیں لکھتے ہیں اور والہانہ انداز سے پڑھتے ہیں۔ مروجہ فن کے اینچ پینچ سے ماورا بھی ایک نوع کی شاعری ہوتی ہے۔ جو عقل وجنون کی آمیزش سے ترکیب پاتی ہے جسے زمزمۂ عشق کہنا چاہیے۔ اُن کی محبت و عقیدت کا وزن شعر اُٹھا ہی نہیں سکتا۔ یہ تو اُن کا کمال ہے کہ شعر سے انھوں نے یہ ناممکن خدمت لے لی ہے۔ میں شرقی صاحب کے

صرف دو شعر پیش کرنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

"تابِ جمال لا نہ سکا میں گناہ گار   مجھ کو تو دن میں تارے نظر آکے رہ گئے

گناہوں کی سیاہی دھل رہی ہے   سرشکِ چشم تر ہے اور میں ہوں

ذکرِ دار و رسن عاطر ہاشمی۔ ناشر: احساس پبلی کیشنز۔ ۱۵ انارکلی لاہور۔ صفحات: ۹۶

قیمت: ۱۲/- روپیہ۔

عاطر ہاشمی کو کون نہیں جانتا۔ اُن کے فن کا ایک سرا "غبر" ہے، دوسرا "نظر"۔ اُن کے سامنے ہونے والے واقعات کی جو لہریں گذر رہی ہیں۔ اُن کے "تاریخ" کا جزو بننے سے پہلے اُن کا عکس عاطر ہاشمی نے اپنی شاعری کے شیشے میں اُتار لیا۔ وہ "دار و رسن" والے شاعر ہیں۔ انہوں نے سیاسی طوفانوں کے تھپیڑے کھاتے ہوئے کچھ موتی اُچھالے ہیں، کچھ خزف ریزے، کچھ پانی کے چھینٹے، کچھ جھاگ کے گالے۔ وقت وقت کے حوادث کے تھپیڑے کھانے والے شاعر کو جو حقائق بیان کرنے ہوتے ہیں وہ اسی طرح مرکب صورت میں ہوتے ہیں۔

عنوانات میں سے چند عرض ہیں، ان سے اندازہ کیجیے کہ شاعری کی جولانگاہ کہاں تک پھیلی ہوئی ہے۔ "میرے قائد نے کہا"۔ "ناکام مہاتشانی"۔ "دیت نام زندہ باد"۔ "چٹان کی ضبطی پر"۔ "حمید نظامی"۔ "ملک غلام جیلانی سے"۔ "چاول ہے کہ سونا ہے"۔ "واپڈا کی نظر"۔ "اعرابِ فلسطین سے"۔ "اتحادِ عالمِ اسلام" وغیرہ وغیرہ۔

بدقسمتی سے اس مجموعے کا طباعتی معیار کمزور ہے۔ آخر میں ایک شعر

اس سے آگے اے غمِ دوراں! احساسِ بیداری ہے
دیوانے تو دار تک آئے، فرزانوں کی باری ہے

عُلماءِ دین! — عُلماءِ طِبّ — بنیئے!!

اور

ایک باعزت، موثر اور مفید — "ذریعہ معاش" جو

دینی خدمات کو موثر اور ان کے دائرہ کو وسیع کرنے کا ذریعہ

بھی ہے — اس سے بہرہ ور ہو جائیے!

— اَلحَمدُ لِلّٰہ —

کہ پاکستان میں دینی مدارس کی اسناد کو طبی تعلیم کے لیے بنیادی صلاحیت تسلیم

کر لیا گیا ہے — اور

جَامعہ طبّیہ اِسلامیہ فیصل آباد

نے یہ فیصلہ کیا کہ دینی مدارس کے فاضل اور درجہ موقوف علیہ سے فارغ

ذہین طلبہ — کو ترجیحی بنیاد پر قبول کیا جائے اور ان میں سے مستحق حضرات

کو فیس وغیرہ میں خصوصی رعایت کا مستحق بھی قرار دیا جائے۔ درخواستیں

بلا تاخیر مع نقول اسناد اور مدرسہ کے مہتمم صاحب کی جانب سے سیرت و

اخلاق کی توثیق کے ساتھ درج ذیل پتہ پر پہنچ جانا چاہئیں۔

(پہلے درخواست پہلے داخلہ کا اصول بھی ملحوظ رہے گا)

عبدالرحیم اشرف — ۳۷۵ - جناح کالونی فیصل آباد